سفر ہی سفر

4030

سید مسعود حسن شہاب دہلوی

Marfat.com

سفر ہی سفر

از:

مسعود حسن شہاب دہلوی

مرتبہ:

سیّد شاہد حسن رضوی

مکتبہ اردو اکیڈمی بہاولپور

Marfat.com

Marfat.com

ترتیب

* پیش لفظ ۔ ۵

۱۔ کراچی سے ڈھاکہ تک ۷

۲۔ صوبہ سرحد میں چند روز ۲۳

۳۔ دلّی نامہ ۸۷

۴۔ بہاولپور سے بخش خاں تک ۱۶۵

۵۔ لاہور سے شرق پور ۱۷۳

۶۔ برکتوں کا سفر (ڈیرہ غازیخاں) ۱۸۰

۷۔ رحیم یارخاں کا سفر ۱۹۱

۸۔ سیالکوٹ سے لاہور تک ۱۹۶

۹۔ کراچی کراچی ہے ۔ ۲۰۷

Marfat.com

ادارہ اردو اکیڈمی بہاولپور " اکادمی ادبیات پاکستان " کا
مشکور گزار ہے جس نے اس کتاب کی اشاعت کے لئے
مناسب مالی امداد مہیا کی۔

~~87296~~

87296

©
جملہ حقوق محفوظ ہیں۔

نام کتاب	سفر ہی سفر
مصنف	مسعود حسن شہاب دہلوی
ناشر	اردو اکیڈمی بہاول پور
مطبع	نفیس پرنٹرز لاہور
سن اشاعت	۱۹۸۹ء
قیمت	[illegible] روپے۔
	Rs 70/-

Marfat.com

پیش لفظ

سفرنامے اُردو ادب میں ایک جداگانہ صنف کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اہلِ قلم ابتدا ہی سے اس موضوع پر مختلف پیرائوں میں اپنی انشاء پردازی کے جوہر دکھاتے رہے ہیں۔ ان سفرناموں سے نہ صرف دنیا کے تاریخی و جغرافیائی حالات، مذہبی و ثقافتی کوائف اور معاشرتی و تمدنی خصائص کا پتہ چلتا ہے بلکہ یہ قوموں کے جذبۂ ترقی کو فزوں تر کرنے اور ان کے ذوقِ اصلاح کو تقویت دینے میں بھی ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔

قبلہ محترم جناب شہاب دہلوی کا نام اور کام جنوبی ایشیا کی تاریخِ ادب میں کس قدر نمایاں ہے۔ اس بارے میں خامہ فرسائی کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔

نظم ہو یا نثر، تحقیق ہو یا تنقید، تاریخ ہو یا سیر غرض ہر موضوع پر قبلہ محترم کا قلم رواں دواں ہے۔ "سفر ہی سفر" بھی ان کے دلکش اندازِ تحریر کا ایک منہ بولتا ثبوت ہے۔ میں اپنی بات میں کہاں تک درست ہوں اس بات کا اندازہ تو آپ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد ہی کر سکیں گے۔

یوں تو اباجی محترم نے اپنی زندگی میں بے شمار سفر کئے جنکا حال مختلف اخبار و رسائل میں شائع بھی ہوا لیکن اس کتاب میں اُن کے چیدہ چیدہ سفرنامے شامل ہیں جن میں پہلا سفرنامہ ڈھاکہ (جو اس وقت مشرقی پاکستان کا دارالحکومت تھا) کا ہے جہاں پاکستان مسلم لیگ کونسل کے سالانہ اجلاس میں بہاولپور مسلم لیگ کے نمائندے کی حیثیت سے شرکت کیلئے گئے اور یوں انہیں دوسرے حصے میں رہنے والے بھائیوں کو نزدیک

Marfat.com

سے دیکھنے اور مشرقی پاکستان کے خوبصورت علاقوں کی سیر کا موقع ملا جو من وعن درج ہے۔

دوسرا سفرنامہ صوبہ سرحد کے متعلق ہے۔ یہ سفر بہاولپور کے صحافیوں کی ایک جماعت کے ساتھ صوبہ سرحد کی حکومت کی دعوت پر کیا۔ اس نوردنہ سفر میں سرحد کے پُرفضا تاریخی مقامات کی سیر بھی کی اور یہاں کی مختلف اہم شخصیات سے ملاقاتیں بھی کیں غرض صوبہ سرحد خوب گھوم پھر کر دیکھا اور جو کچھ دیکھا اسے اپنے سفرنامے کے دامن میں بھر دیا۔

تیسرا بڑا سفر "دہلی نامہ" ہے۔ دہلی اباجی کا وطن مالوف بھی ہے آپ ہجرت کے ۲۵ سال بعد پہلی مرتبہ وہاں گئے تو دہلی کو بہت مختلف پایا۔ اپنے بیس روزہ قیام دہلی میں آپ کے شب و روز انتہائی مصروف گذرے وہاں مختلف تاریخی مقامات کی سیر کے علاوہ بے شمار تقریبات میں شرکت اور اہم شخصیات سے ملاقاتوں کا حال آپ نے جس دلنشیں اور خوبصورت انداز میں تحریر کیا ہے پڑھنے کے بعد ہی اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ کراچی اور لاہور، سیالکوٹ اور شرقپور شریف، ڈیرہ غازیخاں اور ناندلیانوالہ، رحیم یارخاں اور بخش خاں کی روداد سفر بھی بہت دلچسپ و معلوماتی ہے۔ ان سفرناموں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے ہر علاقہ کا مذہبی و معاشرتی نقطۂ نگاہ سے بنظر غائر مطالعہ کیا اور جہاں جہاں آپ گئے وہاں کی تاریخ و ثقافت کو خود بھی سمجھنے کی کوشش کی اور اپنے قارئین کو بھی اس میں شریک کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان سفرناموں میں حسن ادب اور ندرتِ بیان کے ساتھ ساتھ واقعات کی دلچسپی آخر تک برقرار رہتی ہے۔

مجھے امید ہے کہ محترم اباجی کی پہلی کتابوں کی طرح اس کتاب کو بھی قارئین پذیرائی بخش کر ادب دوستی کا ثبوت دیں گے۔

شاھد حسن رضوی

Marfat.com

کراچی سے ڈھاکہ[1] تک

۹۔ اکتوبر :

اس وقت رات کے بارہ بجے ہیں۔ بہاولپور اور سندھ کے تمام کونسلر ڈرگ روڈ کے ہوائی اڈے پر موجود ہیں۔ ائر انڈیا کے "سکائی ماسٹر" کے انتظار میں سب کی آنکھیں آسمان پر لگی ہوئی ہیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد کونسلر ائر انڈیا کے دفتر میں جاتے ہیں اور سکائی ماسٹر کی خبر معلوم کرتے ہیں۔ بہت سے تو انتظار کرتے کرتے اس قدر تھک چکے ہیں کہ انہوں نے ہوائی اڈہ کے بنچوں پر ہی ڈیرے ڈال دیے ہیں بعض لوگ شوق انتظار میں کبھی ریسٹورنٹ کا رخ کرتے ہیں۔ اور کبھی ہوائی جہازوں کا تماشہ دیکھنے باہر نکل جاتے ہیں۔ بڑے انتظار کے بعد سکائی ماسٹر کی صورت نظر آئی۔ اس وقت کوئی ۳ بجے کا عمل ہے۔ ستاروں نے اپنا رختِ سفر باندھنا شروع کر دیا ہے۔ ہم لوگ بھی اپنے کوٹ پتلون سنبھال کے تیار ہو گئے ہیں۔ آخر ڈھاکہ جانے والوں کو طیارہ کے قریب پہنچنے کا مژدہ جانفزا سنایا گیا۔ بسم اللہ اور کلمۂ خیر پڑھتے ہوئے سب نے جہاز میں قدم رکھا۔ یہ جہاز بہاولپور اور سندھ کے کونسلروں کیلئے مخصوص ہے۔ عام طور پر ہوائی جہاز میں سفر کرنے والے ٹیل (دُم) کی کسی نشست پر بیٹھنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ لیکن راقم الحروف کو اتفاق سے انجن کے قریب والی نشست ملی۔ میرے بازو والی نشست پر ہمارے ڈپٹی سپیکر چوہدری بشیر احمد چیمہ براجمان ہیں۔ پچھلی نشستوں پر میاں فتح محمد لالیکا، راؤ حفیظ الرحمن اور شیخ عبدالرحمن وغیرہ فروکش ہیں۔ جب سب حضرات اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے تو ہوائی جہاز کا دروازہ بند کر دیا گیا، اور سامنے سگریٹ کی ممانعت اور نشستی پٹی

[1] ڈھاکہ ابھی مشرقی پاکستان کا حصہ تھا اور بنگلہ دیش نہیں بنا تھا۔

Marfat.com

باندھنے کی ہدایت سرخ رنگ میں نمودار ہوگئی۔ میں نے دیکھا کہ اس وقت بہت سے کونسلروں کے چہرے فق تھے لیکن مجبوری کا نام صبر ہوتا ہے۔ سب نے اپنی اپنی پیٹیاں باندھ لیں جو لوگ ناواقف تھے انکی امداد ہوسٹس (Hostess) نے کی۔ ہمارے محترم دوست شیخ عبدالحمید صاحب صحرائی کی پیٹی باندھنے کی سعادت بھی ایک ہوسٹس کو حاصل ہوئی۔ الغرض ان تمام کاروائیوں کے بعد طیارہ نے جنبش کی، پہلے موٹر کی طرح زمین پر چلا پھر آہستہ آہستہ ہوا میں معلق ہوتا گیا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے سطح زمین سے سینکڑوں فٹ بلندی پر پہنچ گیا۔ جوں جوں راستہ طے ہوتا جاتا تھا طیارہ اور بلند ہوتا جارہا تھا۔ تقریباً تین گھنٹے کی پرواز کے بعد ہم دہلی پہنچ گئے۔ دہلی تک کا راستہ بڑی خوش اسلوبی اور آرام کے ساتھ پورا ہوا۔ نہ کوئی جھٹکا لگا اور نہ کوئی ہچکولا آیا۔ یہاں ہمارے طیارہ نے اپنا پٹرول حاصل کیا۔ اور ہم لوگ حوائج ضروری سے فارغ ہوئے۔ پورے ایک گھنٹہ بعد ہمارا طیارہ دوبارہ پرواز کیلئے تیار ہوگیا۔ جب ہم سب اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے تو اس نے اپنی اڑان دکھائی۔ تھوڑی دیر تک تو ہم حسبِ سابق لطف اندوز ہوتے رہے لیکن جب یکدم سکائی ماسٹر ہزاروں فٹ کی بلندی سے کئی سو فٹ نیچے آگیا تو لوگوں کے پسینے چھوٹ گئے اور سارا مزا کرکرا ہوگیا۔ میں نے اس وقت کن انکھیوں سے اپنے پہلو میں بیٹھے ہوئے دوست کی طرف دیکھا تو وہ آنکھیں بند کئے زور زور سے کلمہ پڑھ رہے تھے۔ انکی یہ کیفیت دیکھ کر مجھ سے ضبط نہ ہوسکا۔ میں نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا "میاں ذرا باہر کا تو نظارہ کرو، دیکھو قدرت اپنی کیا نیرنگیاں دکھا رہی ہے" لیکن میری اس حرکت پر وہ خفیف ہونے کی بجائے مجھے بری بری نظروں سے گھورنے لگے اور جب میں نے انہیں زیادہ تنگ کیا تو وہ جھلا کر بولے "یہ وقت ہنسی مذاق کا نہیں۔ کوئی کلمہ درود پڑھو"۔ اس دوران میں میری نظر

Marfat.com

جب اپنے دوسرے ساتھیوں پر پڑی تو ان میں سے بعض کی طبیعت تو بہت ہی خراب تھی۔ دراصل موسم کی خرابی کی وجہ سے طیارہ کو بار بار اوپر نیچے ہونا پڑتا تھا۔ بادلوں کا کا اتنا زور تھا کہ کئی کئی سو فٹ نیچے آجانا پڑتا تھا۔ الغرض دہلی سے ڈھاکہ تک کا سفر اسی طرح بادلوں سے کشتی لڑتے ختم ہوا۔ خدا خدا کرکے ڈھاکہ آیا تو جان میں جان آئی۔

ڈھاکہ کے ہوائی اڈے پر مشرقی بنگال کی صوبائی مسلم لیگ کے عہدیداروں اور کارکنوں کے علاوہ پنجاب کے وزراء اور سندھ کے مسٹر یوسف ہارون موجود تھے سب بڑی گرمجوشی کے ساتھ ہمارا استقبال کیا۔ والنیٹروں نے جلدی جلدی ہمارا اسباب لاریوں اور لبسوں میں رکھا اور ہمیں کاروں میں بٹھا کر ہماری مجوزہ قیامگاہ پر لے گئے یہ جگہ یونیورسٹی بلڈنگ کے نام سے موسوم ہے اور ڈھاکہ کی شاندار عمارتوں میں اس کا شمار ہے اس کے عالیشان کمرے جو پلنگوں بستروں اور دوسری ضروری اشیاء سے مزین تھے، ہمارے لئے وقف کردیے گئے تھے۔ اسی جگہ بستری چائے (Bed tea) سے لیکر ڈنر تک کا انتظام تھا اور منتظمین و کارکنان وقت پر خود آکر ہمیں کھانے کے کمروں میں لے جایا کرتے تھے۔ ڈھاکہ میں ہمارا چھ سات روز تک قیام رہا۔ اس دوران میں ہمارے بنگالی بھائیوں نے مہمان نوازی اور میزبانی کا حق ادا کردیا۔ والنیٹروں کا جذبۂ خدمت بھی قابلِ قدر تھا۔ وہ شروع سے آخر تک ہمارے ساتھ رہے اور ہمارے آرام و آسائش کا ہر دم خیال رکھتے رہے

جس دن ہم ڈھاکہ پہنچے ہیں یہاں موسلادھار بارش ہو رہی تھی۔ دوسرے ہوائی سفر نے ہمیں پریشان بھی خاصہ کیا تھا اسلئے کہیں چلنے پھرنے کی ہمت نہ ہوئی اگلے روز بھی تقاطر کا سلسلہ جاری تھا لیکن اس کے باوجود ہم ایک ٹیکسی لے کر شہر کے گشت کو نکل گئے۔ تقریباً دو گھنٹے شہر کا دورہ کرنے کے بعد ہم اپنی قیامگاہ

Marfat.com

آگئے۔ بازاروں میں نواب پور روڈ اور پاٹوٹولی اچھے بارونق بازار ہیں لیکن یہاں عام طور پر بڑے شہروں کی طرح اچھے اور عمدہ ہوٹل نظر نہیں آتے۔ شاید یہاں کے لوگ پرانی تہذیب کیمطابق ہوٹلوں اور بازاروں کے کھانے پینے کو معیوب سمجھتے ہیں۔ یہاں کی سڑکیں تقریباً تمام خستہ حالت میں ہیں معلوم ہوتا ہے تقسیم ملک کیبعد اب تک ان کی مرمت اور درستی کی طرف توجہ نہیں دی جا سکی ہے۔ شفاخانوں اور سکولوں کے اعتبار سے بھی ڈھاکہ ابھی تک ترقی یافتہ شہروں کے معیار پر نہیں آیا۔ شہر کے اردگرد کہیں بھی کوئی تفریحی مقام نہیں۔ لے دیکر ایک بوڑھی گنگا ہے جس کا حسن و شباب پہلے ہی سے ڈھل چکا ہے۔ یہاں ناریل کے چھلکے اور گندگی کے ڈھیر اس قدر نظر آتے ہیں کہ گنگا کی لطافت کثافت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اگر اس مقام کو صاف ستھرا رکھا جائے تو اچھا تفریحی مقام ثابت ہو سکتا ہے۔ یہاں اور تو کوئی خاص یادگار نہیں ملتی البتہ جابجا مسجدوں کی بہتات قدیم اسلامی روایات کا پتہ دیتی ہے۔ ایک اور چیز جس نے ہمیں سب سے زیادہ متاثر کیا وہ یہاں پردہ کا رواج ہے۔ ہم نے اپنے سات روز کے قیام میں ایک مسلمان عورت کو بھی بازاروں یا گلیوں میں بے پردہ پھرتے چلتے نہیں دیکھا۔ عام طور پر لوگوں کا معیارِ زندگی پست معلوم ہوتا ہے۔ غربت اور افلاس کے مارے ہوئے لوگ زیادہ نظر آتے ہیں۔ بایں ہمہ ان میں اسلامی اخوت اور مذہبی فریفتگی کا جذبہ پورے طور پر ملتا ہے۔ یہاں کے لوگ عموماً نمازی اور سیدھے سادھے مسلمان معلوم ہوتے ہیں۔

ڈھاکہ کے چاروں طرف سبزہ زار ہی سبزہ زار ہے۔ جگہ جگہ ناریل اور اناناس کے درخت بڑے بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن یہ حقیقت افسوسناک ہے کہ اس سنہری ریشوں والے شہر میں دریا کے کناروں پر رہنے والے بڑی کسمپرسی اور ہلاکت کی زندگی گذارتے ہیں۔

Marfat.com

ڈھاکہ سے کچھ میل کے فاصلے پر نارائن گنج ہے جہاں پٹ سن کے کئی کارخانے ہیں۔ ان میں آدم جی جیوٹ ملز سب سے بڑا اور شاندار ہے۔ ایک دن اسکو دیکھنے کیلئے ہمیں خواجہ ناظم الدین کی معیت میں لے جایا گیا تھا۔ نارائن گنج سے آدم جی جیوٹ ملز کا سفر ہم نے اسٹیمر کے ذریعے کیا تھا۔ یہ ملز ابھی زیرِ تعمیر ہے۔ خیال ہے کہ جب یہ مکمل ہو جائیگا تو یہاں معتدبہ مقدار میں پٹ سن کھپ جائیگی۔ اور اس سے بہت حد تک بیرونی ملکوں کی مانگ بھی پوری ہو سکے گی۔ اب تک پٹ سن کی صنعت پرائیوٹ لوگوں کے ہاتھ میں تھی۔ لیکن اب گورنمنٹ خود اس صنعت کے فروغ میں دلچسپی لے رہی ہے۔ آدم جی جیوٹ ملز میں تقریباً نصف حصے یہاں کی گورنمنٹ کے ہیں۔

آدم جی جوٹ ملز دیکھنے کے بعد ہم چاند پور تک سیٹمر گئے اور پھر وہاں سے نرائن گنج آگئے۔ یہ ٹرپ آٹھ گھنٹے سے بھی زیادہ کا رہا۔ صبح کا ناشتہ ہمیں آدم جی جیوٹ ملز کی طرف سے دیا گیا تھا۔ اور دوپہر کا کھانا اسٹیمر میں ہی کھایا۔ اسٹیمر میں دریائے برہم پترہ کے سرے تک نکل آتے تھے۔ یہ دریا اپنے پاٹ کے اعتبار سے کافی وسیع ہے اور سمندر میں جاکر مل جاتا ہے اور اس ٹرپ میں بالکل پکنک کا مزہ آگیا۔ اسٹیمر میں بیٹھنے سے پہلے جب ہم نرائن گنج کے اسٹیشن پر پہنچے تھے تو یہاں ہم کو "انصار" نے سلامی دی تھی۔ ہم حیران تھے کہ فوج ہمارا خیر مقدم کیوں کر رہی ہے۔ تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ ایک رضا کارانہ تنظیم ہے جو انصارِ مدینہ کی مثالی روشنی میں خدمتِ خلق اور حب الوطنی کا اعلیٰ کردار پیش کرتی ہے۔ انصار نے اپنے آپ کو بالکل فوجی سانچے میں ڈھال لیا ہے۔ اور اب وہ نہ صرف معاشرتی و تمدنی اصلاح کا کام کرتے ہیں بلکہ اپنے ملک کی سرحدوں کی حفاظت کو بھی اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ یہ تنظیم صحیح معنوں میں تقسیم ملک کے بعد مہاجرین کی امداد کیلئے معرضِ وجود میں آئی تھی اور رفتہ رفتہ یہ ترقی کرتی گئی اور اب تو اس کی

Marfat.com

تعداد لاکھوں تک پہنچ چکی ہے۔

ریور ٹرپ میں ہم چاندپور تک گئے لیکن نہ معلوم کس مصلحت کی بنا پر ہمیں وہاں اترنے نہ دیا گیا۔ حالانکہ چاندپور والے ہماری آمد کی اطلاع پر سینکڑوں کی تعداد میں کنارے پر موجود تھے اور بہ آواز بلند پاکستان زندہ باد اور مسلم لیگ زندہ باد کے نعرے لگا رہے تھے۔ ہم نے بھی مجبوراً اسٹیمر سے ہی ان کے نعروں کا جواب نعروں میں دیا اور اسطرح تھوڑی دیر کیلئے دریا کی پرسکون موجوں میں ارتعاش پیدا ہو گیا۔

دریا کی سیر سے پہلے ہم مسلم لیگ کونسل کے ایک اجلاس میں عہدیداروں کا انتخاب اور دوسرے میں کچھ رولز میں ترمیمیں کر چکے تھے۔ اس ٹرپ سے واپسی پر ہمیں کئی اہم قراردادوں اور ایک غیر معمولی اہم ترمیم کا فیصلہ کرنا تھا۔ چنانچہ نرائن گنج سے واپس آکر ہم نے کھانا کھایا اور ٹھیک آٹھ بجے کرزن ہال میں پہنچ گئے جہاں لیگ کونسل کا اجلاس منعقد ہو رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ ہم مذکورہ اجلاس کی کاروائی اپنے قارئین کو سنائیں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ سابق اجلاسوں کی روداد کا ایک ہلکا سا عکس بھی آپکی نظروں کے سامنے پیش کردوں۔

<u>۱۱۔ اکتوبر</u> :

پاکستان مسلم لیگ کونسل کا اجلاس ۱۱۔ اکتوبر کو سہ پہر کے دو بجے کرزن ہال میں شروع ہوا۔ ہال میں صدر، دیگر عہدیداران اور مرکزی وزرا کیلئے مخصوص اور نمایاں نشستیں بنائی گئی تھیں۔ وسط میں خواجہ ناظم الدین اور ان کے دائیں بائیں میاں ممتاز دولتانہ، خان عبدالقیوم خاں، مخدوم الملک سید غلام میراں شاہ، محمد ایوب کھوڑو، نورالامین، نواب مشتاق احمد گورمانی، غیاث الدین پٹھان ڈاکٹر محمود الحسن اور سردار عبدالرب نشتر تشریف فرما تھے۔ باقی کونسلروں کیلئے

Marfat.com

ہال کے وسط میں کرسیوں کا انتظام تھا۔ انہیں کے ساتھ ایک طرف چند عورتیں تھیں جن میں بیگم سلمیٰ تصدق بیگم جی اے خاں اور بیگم عرفان اللہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

اجلاس کا آغاز تلاوتِ قرآن مجید سے ہوا۔ اس کے بعد ایک صاحب نے بنگالی زبان میں قومی نظم سنائی جس پر بنگالی زبان کے جاننے والوں سے زیادہ بنگالی زبان نہ جاننے والوں نے داد دی۔ اس رسمی کارروائی کے بعد کونسل کے عہدیداروں کا انتخاب عمل میں آیا۔ سب سے پہلے صدارت کیلئے پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ میاں ممتاز دولتانہ نے خواجہ ناظم الدین صاحب کا نام نامی تجویز کیا جس کی تائید کے بعد دیگرے فرنٹیئر، سندھ بہاولپور اور مشرقی بنگال کی مسلم لیگیوں کے صدروں نے کی۔ کونسل کے باقی ممبران نے تالیوں اور نعروں کیساتھ اس تجویز کا خیر مقدم کیا اور خواجہ صاحب حسبِ سابق بہ اتفاقِ آراء پاکستان مسلم لیگ کے صدر منتخب ہو گئے جس طرح یکجہتی اور یک دلی کیساتھ صدارت کا انتخاب عمل میں آیا۔ اسی طرح جنرل سیکرٹری، خزانچی، نائب صدر اور جائنٹ سیکرٹریوں کا انتخاب بھی متفقہ طور پر رہا۔ پنجاب کے چوہدری صلاح الدین جنرل سیکرٹری، بہاولپور کے مخدوم الملک سید غلام میراں شاہ صاحب خزانچی، سندھ کے یوسف ہارون نائب صدر اور بنگال و سرحد کے غیاث الدین پٹھان اور اکبر شاہ جائنٹ سیکرٹری مقرر ہوئے۔ ہر عہدیدار نے اپنے انتخاب کے بعد ایوان کا شکریہ ادا کیا اور مسلم لیگ اور عوام کی خدمت کیلئے تجدید عہد کی۔

کونسل کے ان مبارک و مسعود ساعتوں میں تھوڑی دیر کیلئے مسٹر غلام علی میمن کی ایک قرارداد نے کچھ بے کیفی پیدا کر دی تھی لیکن اس کا اثر بہت جلد زائل ہو گیا۔ مسٹر غلام علی میمن نے مندرجہ ذیل اعتراضات کی رو سے ان انتخابات کو غیر آئینی قرار دینے کی تحریک پیش کی تھی۔

۱۔ کونسل کے اجلاس میں بلوچستان مسلم لیگ کے نمائندے شامل نہیں۔

Marfat.com

۲۔ اجلاس میں کراچی کے نمائندوں کو شریک نہیں کیا گیا۔

۳۔ مشرقی بنگال مسلم لیگ کے جو نمائندے اجلاس میں شریک ہوئے ہیں انمیں بہت سے نمائندے باقاعدہ منتخب نہیں ہوئے اور کئی ارکان کی میعاد رکنیت ختم ہو چکی ہے۔

اس قرارداد پر توقع کے مطابق کوئی خاص بحث وتمحیص نہیں ہوئی بلکہ خواجہ صاحب نے رولنگ کے طور پر تمام اعتراضات کا جواب ان الفاظ میں کونسل کو سنا دیا گیا۔

۱۔ عہدیداروں کے انتخاب کیلئے کونسل کے اجلاس میں پاکستان مسلم لیگ کے ہر یونٹ کے نمائندوں کا شریک ہونا ضروری نہیں۔ علاوہ ازیں صدر کو انتخاب کیبعد بھی مجلس عاملہ کے ارکان کی تعداد بڑھانے کا اختیار حاصل ہے۔

۲۔ کراچی کو نمائندگی دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ ابھی تک اُسے صوبہ کا درجہ نہیں دیا گیا۔

۳۔ مسلم لیگ کے آئین میں ایسی کوئی شرط نہیں کہ اگر کسی رکن نے ایک سال تک چندہ نہ دیا ہو تو وہ جماعت کا رکن نہیں رہ سکتا۔

اِن جوابات کے بعد معترض نے خاموشی اختیار کرلی اور ارا کین کونسل نے رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت کہہ کر اطمینان کا سانس لیا۔ کونسل کا اجلاس آج سہ پہر کو شروع ہوا تھا جو ایک گھنٹہ سے زیادہ دیر تک جاری رہا۔ آج کے اجلاس میں پاکستان کے تمام صوبوں سے مسلم لیگ کے چار سو مندوبین نے شرکت کی تھی۔

۱۲ر اکتوبر :

آج صبح ۹ بجے مسلم لیگ کونسل کے اجلاس کی کاروائی شروع ہوئی۔ اس اجلاس میں بہت سی قانونی ترمیمیں پیش ہوئیں جو کثرت رائے سے

Marfat.com

منظور ہوتی رہیں۔ ان پر زیادہ تر بنگال والوں نے موشگافیاں کیں۔ ایک ترمیم کے ذریعے (معمولی سی جھڑپ کے بعد) یہ بھی طے پاگیا کہ آئندہ صدر کا انتخاب ایک سال کی بجائے تین سال میں ہوا کریگا۔ سب سے آخر میں جو ترمیم پیش ہوئی اس پر کافی دیر اچھا خاصہ ہنگامہ برپا ہوتا رہا۔ یہ ترمیم غیاث الدین صاحب پٹھان کی جانب سے پیش ہوئی تھی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ "اگر پاکستان مسلم لیگ کونسل اور مجلسِ عاملہ کا اجلاس پاکستان کے کسی حصہ میں منعقد ہو تو اس میں ہر ایک صوبہ کی مجموعی نمائندگی کے حساب سے اس صوبہ کے نمائندوں کو ووٹ دینے کا حق حاصل ہوگا چاہے اجلاس میں اس یونٹ کے پورے نمائندے شریک نہ ہوں۔

اس ترمیم کے مخالف و موافق بہت سی تقریریں ہوئیں۔ صوبہ سرحد اور مشرقی بنگال والے اس ترمیم کے حق میں تھے اور پنجاب، سندھ اور بہاولپور کے کونسلرز اس کے مخالف تھے۔ موافقین کا خیال یہ تھا کہ اس ترمیم سے صوبائی مسلم لیگوں کو کافی سہولت پہنچ جائے گی۔ مسلم لیگ کونسل کے بہت سے ارکان کونسل کے جلسوں میں شرکت کیلئے پاکستان کے ایک حصہ سے دوسرے حصہ تک سفر نہیں کر سکتے اسلئے ہر ایک رکن کیلئے اجلاس میں شرکت لازمی نہیں ہونی چاہیے اور ہر ایک یونٹ کو اجلاس میں شریک ارکان سے قطع نظر پورے ووٹ کا حق ملنا چاہیے۔

اس کے برعکس ترمیم کے مخالف اس ترمیم کو غیر جمہوری، غیر اصولی اور غیر منصفانہ ظاہر کر رہے تھے۔ ان کا یہ محکم یقین تھا کہ اگر یہ ترمیم منظور ہو گئی تو اس کے بعد صوبوں کے صدر، سیکرٹری یا چند مخصوص افراد کے علاوہ کونسل کے اجلاس میں تمام کونسلر شریک نہ ہو سکیں گے۔ اور حضرات اقتدار اپنے پسند اور مرضی کے آدمیوں کو ساتھ لیکر کونسل کے جلسوں میں شمولیت کر لیا کریں گے۔ ان کی یہ بھی رائے تھی کہ اس ترمیم سے جملہ کونسلران کے حقوق پر ڈاکہ پڑنے کا خدشہ ہے۔

Marfat.com

کونسلران کے باہمی رد و قدح کے بعد خان عبدالقیوم خاں نے اس ترمیم کے حق میں تقریر کی اور نفسیاتی طور پر اپنے صوبے کے کونسلران کے علاوہ دوسرے کونسلروں کو بھی اپنی رائے سے متاثر کرنے کی کوشش کی لیکن کونسل کا رنگ جوں کا توں رہا۔ اس کے بعد میاں ممتاز دولتانہ نے تقریر کی جو بہت حد تک غیر جانبدارانہ تھی۔ اسلئے پنجاب کے کونسلروں کے حوصلے قائم رہے اور وہ اس ترمیم کی مخالفت پر ڈٹے رہے۔ آخر میں صاحبِ صدر نے اسے آئندہ اجلاس پر ملتوی کرنے کا اعلان کر دیا۔ اس مرحلہ پر اکثر کونسلروں نے ووٹنگ کی اپیلیں بھی کیں لیکن صاحبِ صدر نے اس امر پر زور دیا کہ کیونکہ یہ ترمیم بڑی اہم ہے اسلئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس پر مزید غور و فکر کیلئے اسے دوسرے اجلاس میں پیش کر دیا جائے۔

۱۳ اکتوبر:

آج اجلاس رات کے ۹ بجے شروع ہوا۔ باوجودیکہ کونسلران آٹھ گھنٹے کے ریلوے ٹرپ کے بعد کافی تھک چکے تھے۔ لیکن زیرِ بحث ترمیم کی وجہ سے بدستور مستعد نظر آ رہے تھے۔ آج ہم نے نوٹ کیا کہ ایک طرف اگر صوبہ بنگال کے بعض کارکن اپنے کونسلروں کا نظروں ہی نظروں میں شمار کر رہے ہیں تو دوسری طرف پنجاب اور بہاولپور والے آپس کی کنویسنگ سے بڑھ کر بنگال کے کونسلروں کے بھی پیچھے پڑ گئے ہیں کہ وہ اس ترمیم کے بارے میں اپنی رائے بدل دیں۔ اس کے علاوہ ڈائس پر بیٹھے ہوئے حضرات بھی ایک دوسرے سے کانا پھوسی اور راز و نیاز کر رہے ہیں۔ اس کی کارروائی کے تعطل کو جب زیادہ دیر گزر گئی تو بہت سے کونسلروں نے صاحبِ صدر کو اس حقیقت کی طرف متوجہ کرنے کیلئے زور زور سے تالیاں بجانی شروع کر دیں۔ اس پر صدر صاحب نے فرمایا کہ آج کے اجلاس میں کئی ضروری قراردادیں بھی پیش ہونی ہیں۔ اسلئے بہتر یہ ہے کہ پہلے ان قراردادوں پر غور

Marfat.com

کرلیا جائے اور اس کے بعد زیر بحث ترمیم کا فیصلہ کرلیا جائیگا۔ لوگوں نے اس رولنگ کے بعد بھی اپنی بیتابی اور بے قراری کا اظہار کیا اور یہ اپیل کی کہ پہلے اس ترمیم کا فیصلہ کرلیا جائے چنانچہ تھوڑی دیر سکوت کے بعد صاحب صدر نے میاں ممتاز دولتانہ کی طرف اشارہ کیا جنہوں نے کسی قدر مردہ دلی کے ساتھ ایک مختصر سی تقریر کی اور آخر میں رائے دی کہ اس ترمیم کو دوبارہ ورکنگ کمیٹی میں پیش کیا جائے جو اس پر نظر ثانی کرے اور مناسب ردوبدل کے بعد آئندہ کونسل کے اجلاس میں پیش کرے۔ میاں صاحب کی تقریر کے بعد کونسل نے بادل نخواستہ اس رائے کو منظور کرلیا اور یہ ترمیم آئندہ کونسل کے اجلاس کیلئے ملتوی ہوگئی۔ اس کے بعد متعدد قرار دادیں پیش ہوئیں جن میں سے مسئلہ کشمیر، نہروں کے پانی اور جنوبی افریقہ اور عربوں سے ہمدردی کی قرار دادیں پیش ہوئیں۔ لیکن اس وقت کونسل کا موڈ کچھ ایسا تھا کہ سوائے مسئلہ کشمیر کے جس پر کافی لمبی چوڑی تقریریں ہوئیں باقی تمام قرار دادیں ادھر پیش ہوتی تھیں اور اُدھر منظور منظور کی صدائیں لگنی شروع ہوجاتی تھیں۔

قرار دادوں کے ختم ہونے پر میاں ممتاز دولتانہ، مسٹر نور الامین اور خواجہ ناظم الدین صاحب نے اختتامی تقریریں کیں اور پاکستان مسلم لیگ کا یہ تاریخی اجلاس رات کے ایک بجے ختم ہوگیا۔

ہمیں پاکستان مسلم لیگ کے اس سیشن کے علاوہ مشرقی بنگال کی صوبائی مسلم لیگ کی طرف سے منعقدہ ایک عظیم الشان پبلک جلسہ میں شرکت کا موقع ملا۔ اس جلسہ کی تیاری پر صوبائی مسلم لیگ نے کافی روپیہ صرف کیا تھا۔ تمام اضلاعی مسلم لیگوں کے کارکن اس کے انتظامات میں شریک تھے۔ اس غرض کیلئے ایک شاندار پنڈال تعمیر کیا تھا جب ہم جلسہ گاہ میں پہنچے ہیں تو دُور دُور تک خلقت نظر آرہی تھی۔

Marfat.com

میرا اندازہ ہے کہ اس جلسہ میں ایک لاکھ سے زائد لوگوں نے شرکت کی تھی۔ ڈائس نہایت حسین وخوبصورت پردوں سے سجایا گیا تھا۔ وہیں معزز مہمانوں، وزیروں، اور عہدیداروں کے بیٹھنے کا انتظام کیا گیا تھا۔

جلسہ کا آغاز حسب معمول تلاوتِ قرآن شریف سے ہوا۔ پھر تین آدمیوں نے ملکر بنگالی زبان کی ایک قومی نظم کا کورس پیش کیا اور اس کے بعد پاکستان مسلم لیگ کے صدر الحاج خواجہ ناظم الدین صاحب نے اردو زبان میں افتتاحی تقریر کی۔ تقریر ابھی شروع ہی ہوئی تھی کہ پنڈال کے دو ایک حصّوں سے کچھ شور وشغب کی آواز سنائی دی۔ تھوڑی دیر تک تو شور اسی طرح ہوتا رہا اور خواجہ صاحب اپنی تقریر کرتے رہے لیکن جب شور انکی تقریر میں اچھی طرح مخل ہونے لگا تو منتظمینِ جلسہ کو ایک گونہ تشویش لاحق ہوئی۔ تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ مائیکروفون کی آواز لوگوں تک نہیں پہنچ رہی۔ اسلئے وہ داویلا کر رہے ہیں۔ چنانچہ فوراً بھاگ دوڑ شروع ہوگئی اور آن کی آن میں مائیکروفون کا یہ عیب نکال دیا گیا۔ اسکے بعد خواجہ صاحب نے نہایت اطمینان کیساتھ اپنی تقریر کی اور لوگوں نے بیحد تحمل وسکون کیساتھ آپ کو سُنا۔ خواجہ صاحب کے بعد مشرقی بنگال کی صوبائی مسلم لیگ کے صدر مسٹر نورالامین تقریر کرنے مائیک کے سامنے آئے۔ اُن کا سامنے آنا تھا کہ ایک سمت سے کچھ نعروں کی آواز آئی۔ یہ نعرے بنگالی زبان میں لگائے جارہے تھے۔ اسلئے کچھ زیادہ ہمارے پلے نہیں پڑے لیکن دریافت کرنے پر ہمیں بتایا گیا کہ یہ لوگ بنگالی زبان کا نعرہ لگارہے ہیں باوجودیکہ مسٹر نورالامین بنگالی زبان میں تقریر کر رہے تھے۔ لیکن ہوٹنگ اور نعرہ بازی انکی تقریر کے آخر تک رہی ہم نے محسوس کیا کہ جس وقت یہ نعرہ بازی ہورہی تھی تو منتظمینِ جلسہ کے چہروں سے خفت اور اداسی ٹپک رہی تھی۔ ہمارے نزدیک بیٹھے ہوئے ایک صاحب نے کہا: "ان لوگوں نے ہمارا منہ کالا کردیا"۔

Marfat.com

ہم اپنے بنگالی بھائی کی اس سادہ بیانی پر زیرِلب مسکرائے اور دل ہی دل میں کہا کہ یہ محاورہ یہاں کیسا چست ہوا ہے۔ اب بھی اگر بنگال کے نادان دوست اُردو کی بجائے بنگالی زبان کا نعرہ لگائیں تو یہ انکی مرضی۔ جہاں تک اردو زبان کی ہمہ گیری اور قبولیت عام کا تعلق ہے، ہمارا یہ یقین اور پختہ ہو گیا کہ بنگال کا بچہ بچہ اُردو زبان سمجھتا ہے اور اپنا مطلب اردو میں بیان کر سکتا ہے۔ ہم نے رکشہ چلانے والے سے لیکر عام راہگیروں تک سے اردو میں بات کرتے دیکھا انہیں ذرا بھی مافی الضمیر سمجھنے اور مدعا ظاہر کرنے میں کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوئی ہم حیران ہیں کہ اُردو کی اس بے پناہ مقبولیت کے باوجود بنگال سے بنگالی زبان کا نعرہ کیوں بلند کیا گیا۔ خیر یہ تو بات میں سے بات نکل آئی ہم تو دراصل اس وقت جلسہ کی روئیداد آپکو سنا رہے تھے۔ ہاں تو اس ہنگامہ آرائی کیبعد خان عبدالقیوم خاں صاحب وزیراعلیٰ صوبہ سرحد، میاں ممتاز دولتانہ وزیراعلیٰ پنجاب، سردار عبدالرب نشتر وزیرِ صنعت پاکستان اور نواب مشتاق احمد گورمانی وزیرِ داخلہ پاکستان نے نہایت مؤثر اور زوردار تقریریں کیں۔ اوّل الذکر دونوں وزرائے اعلیٰ نے انگریزی میں اور موخر الذکر حضرات نے اُردو میں تقریریں کیں صرف میاں ممتاز دولتانہ کی تقریر میں معمولی سا شور مچا اور کسی طرف سے Shame, shame (شرم۔ شرم) کی آوازیں آئیں جس پر میاں صاحب نے بڑی حاضر دماغی سے کام لیا اور یہ فرمایا کہ:

"میں مشرق و مغرب کے بُعد کے باوجود آج یہ محسوس کر رہا ہوں کہ میں پنجاب کی سرزمین پر کھڑا ہوں اور مجھے اپنے پنجابی بھائیوں سے مخاطب ہونا پڑ رہا ہے"

باقی تمام تقریروں میں سردار عبدالرب نشتر کی تقریر کو سب سے زیادہ پسند کیا گیا، لیکن یہ عجیب بات تھی کہ جلسہ گاہ سے واپسی پر ہم نے اکثر عوام کو یہ کہتے سُنا

Marfat.com

کہ پاسپورٹ کے متعلق کسی مقرر نے کوئی روشنی نہیں ڈالی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس جلسہ میں زیادہ تر لوگ اس مسئلہ کا حل تلاش کرنے گئے تھے اور وہ اس بارے میں بہت متفکر تھے۔

ڈھاکہ میں ہماری مصروفیت ۱۳ر اکتوبر کو ختم ہو چکی تھی۔ ۱۴ر اکتوبر کو ہم نے اپنا زیادہ وقت بازاروں میں صرف کیا۔ عام طور پر لوگوں کو ڈھاکہ کی ململ کی جستجو تھی۔ ایک زمانہ تھا کہ وہاں کی بنی ہوئی ململ کا پورا تھان ایک چھوٹی سی ڈبیہ میں آجایا کرتا تھا۔ سنا ہے بعد میں ان کاریگروں کے ہاتھ کاٹ دیے گئے تھے اور ڈھاکہ کی یہ صنعت جب سے ختم ہوگئی۔ اسکے باوجود لوگوں نے ہم سمیت یہاں کی بنی ہوئی ململ خریدی۔ یہ ململ عام ولایتی ململ سے زیادہ اچھی نہیں اور قیمت میں بھی کسی قدر مہنگی پڑتی ہے۔ تاہم سوغات کے طور پر اس کے ایک ایک دو دو تھان ضرور خرید لئے گئے۔

۱۵ر اکتوبر کی صبح کو ہماری واپسی تھی۔ رات کو ہمیں بتایا گیا کہ کیونکہ بھارت نے پاسپورٹ سسٹم نافذ کردیا ہے، اسلئے ہم بھارتی ہائی کمشنر کا ویزا حاصل کئے بغیر یہاں سے کراچی نہیں پہنچ سکیں گے چنانچہ رات ہی رات میں ہم نے اپنے فوٹو کھنچوالئے لیکن صبح ہوتے ہی ہمیں معلوم ہوا کہ ہمیں پاسپورٹ کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ ڈھاکہ ٹائم کے پورے ۱۲ر بجے وہی سکائی ماسٹر جس کے ذریعے ہم یہاں پہنچے تھے، ہمیں اور سندھ کے کونسلروں کو لیکر روانہ ہوگیا۔ تقریباً ایک گھنٹہ میں ہم کلکتہ کے ہوائی اڈا (ڈم ڈم) پر پہنچ گئے۔ یہاں سے کوئی ۴۵ منٹ بعد ہمارا جہاز براہ راست کراچی کیلئے روانہ ہوگیا۔ ڈم ڈم سے کراچی تک ہوائی سفر پورے چھ گھنٹے کا تھا۔ ہم ابھی ڈم ڈم سے کچھ ہی دور ہی تھے کہ ہمارے پائیلٹ کو یہ معلوم ہوگیا کہ انجن میں کچھ خرابی ہے۔ اس نے فراست سے کام لیا اور جہاز کو ڈم ڈم میں ہی واپس

Marfat.com

اتار دیا۔ ہمیں اس واقعہ سے یک گونہ پریشانی تو ہوئی لیکن ساتھ ہی اطمینان بھی ہوا کہ خدا نے خیر کرلی۔ اگر خدانخواستہ جہاز کچھ دور نکل جاتا اور وہاں اترنے کی کوئی جگہ بھی نہ ہوتی تو نہ معلوم کیا حشر ہوتا؟ ہم جہاز میں سے اتر کر انڈو پاکستان کے دفتر کے سامنے آگئے۔ برابر کے کمروں اور ریسٹورنٹ وغیرہ میں پاسپورٹ کی وجہ سے ہمارا جانا منع تھا۔ اس وقت ہماری کیفیت جنگی قیدیوں کی سی تھی۔ اس خبر نے ہمارے اور بھی اوسان خراب کر دیے کہ رات بھر جہاز ٹھیک نہ ہوگا۔ ممکن ہے کہ صبح ہوتے ہی ہم یہاں سے روانگی کے قابل ہو جائیں۔ اس قید و بند کیساتھ رات کاٹنا ہمیں دوبھر معلوم ہو رہا تھا اور پھر کلکتہ دیکھنے کا شوق بھی ہمارے دلوں میں چٹکیاں لے رہا تھا۔ اسلئے یہ ترکیب سمجھ میں آئی کہ کلکتہ میں پاکستان کے ڈپٹی ہائی کمشنر کو ٹیلیفون کیا جائے۔ چنانچہ ٹیلیفون پہنچتے ہی ڈپٹی ہائی کمشنر کا سٹاف ہماری دیکھ بھال کیلئے وہاں آگیا۔ وہ نہایت ہمدردی کیساتھ ہم سے پیش آئے اور انہوں نے ہماری خواہش کے مطابق بھارتی حکومت سے اجازت حاصل کر کے ہمیں کلکتہ کے شہر میں لیجانے کا بندوبست کر دیا۔ ہم آنِ واحد میں کلکتہ کے براڈ وے ہوٹل میں پہنچ گئے جہاں ہماری رہائش اور کھانے پینے کا انتظام ائر انڈیا کی جانب سے کیا گیا تھا۔ اس لئے ہمیں یہاں ایک پیسہ بھی صرف کرنا نہیں پڑا بدقسمتی سے اس ہوٹل کے منیجر ایک سردار جی تھے جنکی شکل دیکھ کر ہماری بھوک بھاگ گئی لیکن سردار جی تھے کچھ سمجھدار اسلئے انہوں نے ہمارے کھانے میں انڈوں کے سالن پر ہی اکتفا کیا۔ اور ہم نے اسے بساغنیمت جانا۔ کھانا کھانے کیبعد ہم نے کلکتہ کے بازاروں کی سیر کی۔ کلکتہ کی سر بفلک عمارتیں اور وسیع و عریض سڑکیں دیکھنے دکھانے کے قابل ہیں۔ کلکتہ ہندوستان کا سب سے بڑا شہر ہے۔ آج یہاں ہندوؤں کی راج دھانی ہے۔ کبھی کلکتہ کی تجارت کا نفاذ ہزار زیادہ

Marfat.com

تر مسلمانوں پر تھا اور آج یہاں مسلمانوں کی کیفیت اچھوتوں سے زیادہ نہیں۔
جب ہم براڈوے ہوٹل پہنچے تو وہاں کے لوگوں نے سمجھا کہ شاید پاکستانی کرکٹ ٹیم آگئی۔ لوگ ہمیں دیکھنے کیلئے اردگرد جمع ہوگئے۔ ہم نے محسوس کیا کہ ہندوؤں کے جذبات ہمارے اور پاکستان کے متعلق اچھے نہیں۔ انہوں نے سب سے پہلے تو ہمیں جان بوجھ کر تنگ کرنے کے خیال سے پاکستانی کرنسی کو تبدیل کرنے سے انکار کردیا۔ جب بہت زیادہ اصرار کیا گیا تو انہوں نے ہمارے روپے کے ۱۲ آنے دیئے۔ انہوں نے یہیں تک بس نہیں کی بلکہ آپس میں فوراً یہ پروپیگنڈہ شروع کردیا کہ کوئی دوکاندار پاکستانی کرنسی نہ لے۔ ان کا یہ طرزِ عمل مجھے بہت شاق گذرا۔ کلکتہ پہنچنے کی جتنی خوشی ہوئی تھی۔ اس واقعہ سے اتنا ہی دل کو دکھ ہوا۔ رات بڑی مشکل سے انگاروں پر لوٹتے کٹی اور صبح ہوتے ہی ہم ڈم ڈم روانہ ہوگئے۔ جہاز تیار ہوچکا تھا جلدی جلدی ہم سب اس میں سوار ہوگئے اور سکائی ماسٹر ہمیں لے کر آسمان کی طرف پرواز کرگیا۔ چھ گھنٹے تک ہم مسلسل ہواؤں میں اڑتے رہے۔ راستہ میں غیر معمولی ہچکولے اور جھٹکے لگے لیکن خدا کا شکر ہے کہ ہم صحیح و سلامت کراچی پہنچ گئے۔

87296
[handwritten number struck through]

Marfat.com

صوبہ سرحد

میں چند روز

بہاولپور سے ٹیکسلا تک:

بہاولپور سے ۹ صحافیوں کا قافلہ شیخ فضل کریم صاحب ڈائریکٹر محکمہ اطلاعات کی معیت میں ۱۴ جولائی کو صوبہ سرحد کے دورہ پر روانہ ہُوا۔ چناب ایکسپریس میں ۱۲ نشستوں کا ایک چھوٹا ڈبہ بہاولپور ریلوے پولیس کی امداد سے ہمارے قبضے میں آگیا تھا۔ شیخ فضل کریم صاحب نے فسٹ کلاس کا ٹکٹ لینے کے باوجود ہمارے ساتھ انٹر کلاس میں سفر کیا۔ ٹرین میں اخراجات کرنے کیلئے ایک مشترکہ فنڈ قائم کیا گیا تھا جس کے انچارج ملک محمد حیات تھے۔ انہوں نے دوپہر کا کھانا بہاولپور ہی میں تیار کرالیا تھا اس کے علاوہ ایک من برف، ۲۰ سیر آم، سکوئیش کی بوتلیں، چٹنیاں غرضیکہ مکمل "زادِ سفر" ساتھ تھا۔ وقت گزارنے کیلئے تاش بھی ہمراہ تھے چنانچہ ایک طرف رمی کی بازی جم گئی اور دوسری طرف "سویپ" اڑنے لگی۔ اسٹیشن آئے اور گذر گئے قہقہوں لطیفوں، اور چٹکلوں اور تاش کی "جان توڑ بازیوں" نے فرصت ہی نہ دی کہ کسی اسٹیشن پر اُترتے۔ ۱۲ بجے کے قریب بھوک نے ستایا اور ہم کھانے پر پل پڑے کیسی میز اور کہاں کا دسترخواں؟ — تمام تکلفات برطرف! صندوق اور ٹرنک میزوں کا نعم البدل ہو گئے۔ بھُنی ہوئی لذیذ مرغیاں، مصالحہ دار چٹنی اور پراٹھے"! کھانے میں لُطف آگیا۔ اور مزے ہی مزے میں ہم اپنی بھوک سے کچھ زیادہ ہی کھا گئے لیکن یارانِ طریقت نے اسی پر بس نہ کیا کیونکہ ابھی انکی للچاتی ہوئی نظریں برف میں لگے ہوئے آموں پر پڑ رہی تھیں۔ جنکی خوشبو سے بقول کسے "ناک میں دم آرہا تھا" لیجیئے چکھنے ہی چکھنے میں آموں کا ٹوکرا آدھا رہ گیا۔ پانی پینے کیلئے برف توڑنے کی

Marfat.com

ضرورت محسوس ہوئی لیکن اس کام کیلئے کوئی چیز نظر نہ آئی۔ آخر ہمارے ایک رفیق کہیں سے "کدال اٹھالائے اور لگے زور آزمائی کرنے"۔ منع کرتے کرتے انہوں نے ساری برف کا چورا کردیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پورے ڈبہ میں پانی پانی ہوگیا اور — فی الحقیقت "جناب میں جوتیاں تیرنے لگیں"۔ بڑی مشکل سے صفائی کیگئی۔ البتہ اس کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ ہمارا ڈبہ مفت میں "ائرکنڈیشنڈ" ہوگیا۔ کچھ آگے چل کر ہمیں پانی کے ایک برتن کی ضرورت پیش آئی اس موقع پر ہمارے اس رفیقِ محترم نے پھر مشکل کشائی فرمائی۔ اسٹیشن آتے ہی حضرت پلیٹ فارم پر اتر گئے اور ایک پانی پلانے والے قلی سے بات کرنے لگے۔ اتفاق سے اس کے پانی کے ٹھیلہ میں ایک خالی بالٹی رکھی ہوئی تھی۔ وہ قلی تو پانی پلانے میں مصروف ہوا اور یہ حضرت نظر بچاکے وہ بالٹی اٹھالائے۔ ہم سب انکی اس ہاتھ کی صفائی پر متحیر ہوگئے اور جب ان سے کہا کہ بھائی اسے واپس کر آؤ تو کہنے لگے کہ واپسی پر اسی صفائی سے ٹھیلہ میں رکھ آؤں گا۔ گاڑی چل دی اور بہت دیر تک یہی حرکت موضوع بحث بنی رہی۔ آخر سب خاموش ہو گئے اور پھر تاش کے پتے پھینٹے جانے لگے۔ وقت گذر رہا تھا۔ اور گاڑی فراٹے بھرتی ہوئی اپنی منزل سے زیادہ قریب ہوتی جارہی تھی۔ سایہ دار درخت گاڑی کی رفتار کا ساتھ دینے کی کوشش کررہے تھے۔ راستہ میں کہیں چٹیل میدان نظر آتے تھے اور کہیں سرسبز لہلہاتے ہوئے کھیت۔ کہیں پھلوں کے باغ دکھائی دیتے اور کہیں جنگلی پودوں کے جھنڈ۔ ہم میں سے بعض ان مناظر سے لطف اندوز ہورہے تھے۔ کچھ کھیلنے میں مصروف تھے اور کچھ اونگھ رہے تھے۔ ۲½ بجے ہم نے اپنی ان سرگرمیوں کو ختم کردیا۔ کیونکہ لائلپور قریب آرہا تھا جہاں ہمارے اعزاز میں "ٹی پارٹی" کا اہتمام کیا گیا تھا۔ تین بجے ہماری ٹرین لائل پور جنکشن پر پہنچ گئی۔ وہاں کے صحافی ہم لوگوں کے استقبال کیلئے پہلے سے موجود

Marfat.com

تھے۔ مختصر سے تعارف کے بعد ہمیں ایک کمرہ میں لے جایا گیا جہاں مختلف فواکہات اور مشروبات سے سجی ہوئی ایک بڑی میز ہماری منتظر تھی چناب ایکسپریس لائلپور ۲۰ منٹ ٹھہرتی ہے۔ ۵ منٹ تو گذر چکے تھے بقیہ پندرہ منٹ میں ہم نے خوب کام و دہن کی آزمائش کی۔ ڈیلی بزنس کے ایڈیٹر چوہدری صاحب ہمارے میزبان تھے جو از راہ خلوص بچھے جارہے تھے۔ پندرہ منٹ کا یہ وقفہ بھی خوب گذرا۔ وہ لوگ چاہتے تھے کہ ہماری پارٹی کم ازکم ایک روز مزدور لائل پور قیام کرے لیکن چونکہ ہمارا پروگرام طے شدہ تھا۔ اسلئے ہم انکی یہ مخلصانہ دعوت قبول نہ کرسکے اور ان کی محبّت اور ٹی پارٹی کا شکریہ ادا کرنے کے بعد اپنے ڈبہ کی طرف لوٹے اور برادرانہ اخوت سے موجزن دلوں کیساتھ ہم نے انھیں الوداع کہا چلتے ہوئے چوھدری صاحب مدیر ڈیلی بزنس نے پاکستان کی ایک ڈائریکٹری اور ایران، مصر اور ہندوستان وغیرہ کے چند اخبارات تحفہ کے طور پر ہمیں پیش کیا تاکہ وقت کٹ سکے۔ گاڑی روانہ ہوگئی اور ہم اپنے صحافی بھائیوں سے اس مختصر سی ملاقات کی یاد دلوں میں لئے اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ شام کے وقت کھانے کا ایک اور دور چلا اور صفایا کرنے کے بعد ایک دوسرے پر" زیادہ خوری" کے الزامات اور فقرے تراشے جانے لگے۔ اسی عرصہ میں ایک دلچسپ لطیفہ ہوا۔ آپ بھی سن لیجئے ہمارے ایک صحافی بھائی (جنہوں نے ابھی کچھ عرصہ سے اپنے اخبار کی باقاعدہ اشاعت کا اہتمام کیا ہے) ہر اسٹیشن پر یہ بتاتے کہ یہاں میرے بیس پرچے لگتے ہیں۔ یہاں ۲۵ پرچے لگتے ہیں۔ یہاں چالیس لگتے ہیں۔ خیر ہم سنتے رہے لیکن ان کی یہ فہرست ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ اسٹیشن آیا تو وہ حضرت اُچھل پڑے اور کہنے لگے آہا! یہاں تو میرے ساٹھ پرچے لگتے ہیں۔ میرے پاس بیٹھے ہوئے ایک ساتھی انکی اس حرکت سے تنگ آچکے تھے۔ یہ سن کر اُن سے نہ رہا گیا

Marfat.com

اور برجستہ بولے "یار کیا یہاں تمہارے پرچے دیواروں پر لگتے ہیں" بس کچھ نہ پوچھئے ہنسی کے مارے ہمارا بُرا حال ہو گیا۔ جب بھی خیال آتا ہے اس جواب کی بے ساختگی پر بے ساختہ لب تبسم ہو جاتے ہیں۔

آہستہ آہستہ دن ڈھلنے لگا نیلگوں آسمان نے شفق کی سرخ چادر سے اپنا منہ ڈھانپ لیا اور سورج دیوتا نے تمام دن ضیا باریاں کرنے کے بعد تھک کر مغرب کی وسیع آغوش میں پناہ لے لی اور گہری نیند سو گیا۔ نیند تو ہمیں بھی آ رہی تھی لیکن ابھی رات کا کھانا باقی تھا چنانچہ "ڈائننگ کار" کے بیروں کو کھانا لانے کا آرڈر دیا گیا جو اگر اچھا نہیں تھا تو زیادہ بُرا بھی نہیں تھا۔ ہم نے بل لانے کو کہا تو انہوں نے پیسے لینے سے انکار کر دیا۔ ہم نے کہا کہ شاید وہ کھانے سے متعلق ہماری "تنقید" سے متاثر ہو کر ایسا کر رہے ہیں چنانچہ ہم نے پیسے دینے کیلئے بیحد اصرار کیا اور اس اقدام کی وجہ پوچھی تو وہ کہنے لگے، "آپ اخبار والے ہیں اور ہمارے بھی معزز مہمان ہیں۔ اور کوئی خدمت بتائیے؟" اس واقعہ نے ہمیں حیرت میں ڈال دیا اور ہم دیر تک اس کے پس منظر و پیش منظر پر غور کرتے رہے ہمیں ابھی پوری رات سفر کرنا تھا۔ اس لئے کچھ دیر آرام کرنے کیلئے چند احباب اسی ڈبہ میں رہے اور چند نے قریب کے ایک اور خالی ڈبہ میں بستر لگا لئے۔ اس طرح رات بہت اچھی طرح گذری۔ صبح چار بجے ہی ہم لوگ ہاتھ منہ دھو کر تیار ہو گئے کیونکہ پشاور سے پہلے راستہ میں ہمیں ٹیکسلا اترنا تھا۔ ٹیکسلا پنجاب میں ہے۔ وہاں کے تاریخی مقامات دیکھنے کیلئے صوبائی حکومت کو کچھ سہولتیں فراہم کرنے کیلئے لکھا گیا تھا جس کے نتیجہ کے طور پر جب ہم ٹیکسلا پہنچے تو ریاض حسن صاحب اسسٹنٹ کیوریٹر (نائب مہتمم) میوزیم ہمارے استقبال کیلئے اسٹیشن پر موجود تھے۔ ویٹنگ روم میں اپنا سامان رکھنے اور اپنا ناشتہ کرنے کے بعد ہم نے تین ٹانگے کرائے پر لئے اور مسٹر ریاض کی معیت میں ٹیکسلا کے قدیم تاریخی کھنڈرات

Marfat.com

دیکھنے کیلئے روانہ ہو گئے۔ سب سے پہلے ہم جولیاں گئے کہا جاتا ہے کہ اس جگہ چونکہ بدھ مت کے بڑے بڑے پیشوا رہتے تھے اسلئے اسے "جائے دلیاں" کہا جاتا تھا جو اب بگڑتے بگڑتے صرف جولیاں رہ گیا ہے۔ جولیاں اسٹیشن سے کوئی پانچ میل کے فاصلہ پر شمال مشرق میں سو فٹ بلندی پر واقع ہے۔ اوپر تک پہنچنے کیلئے ایک سڑک بنائی گئی ہے جس پر ایک خاص قسم کی مٹی بچھائی گئی ہے تاکہ پاؤں نہ پھسلے تین سو فٹ کی چڑھائی کے بعد جب ہم اوپر پہنچے تو ہمارے بھاری بھرکم ساتھی اسطرح سانس لے رہے تھے جیسے وہ ابھی ماؤنٹ ایورسٹ تسخیر کر کے آئے ہوں جولیاں کے چاروں طرف مضبوط حصار ہے۔ مرکزی دروازے کے قریب ہی تھوڑی سی جگہ موجود ہے جہاں سے پوری وادی پر ایک طائرانہ نظر ڈالی جا سکتی ہے۔ یہاں سے سامنے کا منظر بڑا دلکش معلوم ہوتا ہے حدِ نظر تک سبزہ ہی سبزہ نظر آتا ہے جس کے درمیان دریا ہے اور وہ نہایت تمکنت کیساتھ بہتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اردگرد بلند و پست پہاڑیاں بھی ہیں جو سینکڑوں انقلابات کے باوجود آج بھی فخر سے سینہ تانے کھڑی ہیں۔ اس روح پرور نظارے کے بعد ہم جولیاں کی عمارت میں داخل ہوئے۔ جولیاں بدھوں کی ایک خانقاہ تھا جسمیں وہ اپنے بڑے بڑے پروہتوں کو دفن کیا کرتے تھے۔ یہاں پرستش بھی کیا کرتے تھے چنانچہ عمارت کے چہار طرف چھوٹے چھوٹے منادر بھی موجود ہیں جنمیں اب بھی بت رکھے ہوئے ہیں سامنے چار پانچ استوپے ہیں۔ استوپہ دوسرے الفاظ میں قبر کو کہتے ہیں لیکن فرق یہ ہے کہ قبر میں انسان کا پورا جسم ہوتا ہے اور استوپہ میں متوفی کی تھوڑی سی خاک! بدھوں کا یہ طریقہ تھا کہ جب ان کا کوئی بزرگ مرجاتا تھا تو اسے جلا کر اسکی خاک کو زمین میں دفن کر دیتے تھے۔ اور وہیں استوپہ تعمیر کر دیا جاتا تھا۔ بزرگ کی خاک یا کسی چھوٹی سی ہڈی کو محفوظ رکھنے کیلئے کئی ڈبیاں بنائی جاتی تھیں۔ پتھر کی ڈبیا میں تانبے کی ڈبیا، تانبے کی ڈبیہ میں چاندی کی اور

Marfat.com

چاندی کی ڈبیا میں سونے کی ڈبیا رکھی جاتی تھی جو استوپوں کی کھدائی کے نتیجہ میں صحیح وسالم برآمد ہوئی ہیں۔ غریب لوگ مٹی اور کالنسی کی ڈبیوں سے بھی کام چلا لیتے تھے۔ کہتے ہیں کہ ہر استوپہ پر ایک گنبد بھی ہوتا تھا جو اب ضائع ہو چکے ہیں، جولیاں کے استوپے چونے اور مٹی کے بنے ہوئے ہیں۔ ان پر نیچے کی طرف ہاتھیوں، شیروں اور دیویوں اور بُدھ کے چھوٹے چھوٹے بت تراشے گئے ہیں جن سے مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ اس استوپے کو سہارا دیئے ہوئے ہیں۔ آگے چل کر چار بڑے استوپے اور نظر آتے ہیں۔ یہیں بدھ کا ایک بڑا بت بھی موجود ہے جسمیں ناف کی جگہ سوراخ ہے جس کے متعلق مشہور ہے کہ اسمیں انگلی رکھنے سے مریض کا درد دور ہو جایا کرتا تھا۔ یہاں دیواروں پر اور بھی بہت سی مورتیاں اور اور چھوٹے چھوٹے استوپے ہیں جنہیں دیکھ کر پانچ سدی پہلے کے فن بت تراشی کے کمال کا معترف ہونا پڑتا ہے۔ اس کیبعد ہم اس جگہ پہنچے جسے خانقاہ کہا جاتا ہے، سب سے پہلے بائیں طرف ایک چھوٹا سا کمرہ آتا ہے جس میں بُدھ اور اسکے خدام کی مورتیوں کا ایک سیٹ بالکل صحیح حالت میں موجود ہے۔ یہ مورتیاں سفید اور خوبصورتی کے لحاظ سے لاثانی ہیں جنہیں ٹیکسلا کے عجائب خانہ میں رکھ دیا گیا ہے ان کی بجائے اگرچہ اس کمرے میں نقلی مورتیاں ہیں لیکن یہ بھی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہاں سے گذرنے کے بعد ایک وسیع صحن دکھائی دیتا ہے جس کے چاروں طرف چھوٹے چھوٹے کمرے ہیں اور ان کے آگے برآمدے۔ درمیان میں بیٹھنے کیلئے ایک کھُلی جگہ بھی موجود ہے۔ کہتے ہیں کہ اس جگہ طلباء کو بُدھ مت کی تعلیم دی جایا کرتی تھی جو تحصیل علم کے بعد بُدھ ازم کی تبلیغ کیلئے روانہ ہوا کرتے تھے۔ چاروں طرف کمرے انہیں کی رہائش گاہ معلوم ہوتے ہیں جن میں روشندان بھی ہیں اور طاق بھی۔ کسی کسی کمرے میں بڑے بڑے مٹکے بھی گڑے ہوئے ہیں۔

Marfat.com

جنمیں وہ لوگ پانی کا سٹاک رکھتے ہونگے کیونکہ بلندی پر واقع ہونے کی وجہ سے پانی کی فراہمی اس وقت یقیناً دشوار ہوگی۔ درمیان میں کھلی جگہ ان کا لیکچر ہال معلوم ہوتا ہے۔ اسکے علاوہ اور بھی کئی کمرے ہیں جن کے آثار و قرائن سے اندازہ لگایا گیا ہے کہ انہیں باورچی خانہ اور بیت الخلاء کے طور پر استعمال کیا جاتا ہوگا۔

بتایا جاتا ہے کہ جولیاں کی یہ عمارات آگ لگنے کی وجہ سے تباہ ہوئیں۔ اس دعوے کی تصدیق اس بات سے ہو جاتی ہے کہ کھدائی کے وقت یہاں سے جلی ہوئی لکڑیاں اور لوہے کی میخیں، قبضے اور دیگر اشیاء برآمد ہوئی تھیں۔

جولیاں سے واپسی پر ہم تھوڑی دیر بنگلہ میں ٹھہرے اور اس کے بعد ہم نے موہڑہ مُرادو کا رُخ کیا جو جولیاں سے دو میل کے فاصلے پر ہے۔ موہڑہ مرادو بھی جولیاں جیسی بدھوؤں کی ایک خانقاہ ہے جسمیں اسطرح کی مورتیاں، استوپے اور طلباء کے کمرے وغیرہ ہیں۔ یہاں کی نئی چیز ایک نئے قسم کا گول استوپا ہے جو بالکل درست حالت میں دریافت ہوا ہے۔ یہ استوپہ عام استوپوں کی طرح چکور ہونے کی بجائے گول ہے اور ۱۲ فٹ لمبا ہے۔ اس استوپہ میں سات چھتریاں ہیں جو نیچے سے اوپر کی طرف بتدریج چھوٹی ہوتی جاتی ہیں۔ ان سات چھتریوں سے سات آسمان مُراد لئے جاتے ہیں۔

اندازہ لگایا جاتا ہے کہ موہڑہ مُرادو کی یہ عمارات دوسری صدی عیسوی سے لیکر پانچویں صدی کے زمانہ کی ہیں۔ اسی نام سے یہاں قریب ہی ایک گاؤں بھی آباد ہے۔ یہاں سے تھوڑی ہی دور موضع جنڈیال ہے جہاں ریت کے خاصے بلند ٹیلہ پر ایک بڑے مندر کے آثار ملتے ہیں جنہیں دیکھ کر اس کی عظمت کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ دروازہ میں داخل ہوتے ہی دو بھاری ستون نظر آتے ہیں۔ اس سے ذرا آگے ایک چوک سا بنا ہوا ہے جس کے چاروں طرف دیواریں ہیں جو اتنی چوڑی ہیں کہ لوگوں کی ایک بڑی تعداد اُن پر بیٹھ سکتی ہیں اس جگہ سے کسی قسم کے بُت وغیرہ دریافت نہیں ہوئے

Marfat.com

اسلئے اس کے متعلق کوئی بات وثوق سے نہیں کہی جا سکتی تاہم قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ کسی زمانہ میں آتش پرستوں کا مندر ہوگا۔ متذکرہ چوک میں آگ جلائی جاتی ہوگی اور اس کے ارد گرد دیواروں پر بیٹھ کر لوگ پرستش کرتے ہونگے۔ مندر دیکھنے کے بعد ہم ٹیکسلا کے قدیم شہر سرکپ گئے جس پر ۲۰۰ ق م تا ۶۰ء یونانی، ساکائی پارتھیائی اور کشان نے بالترتیب حکومت کی۔ کہتے ہیں کہ یہ شہر چار دفعہ برباد ہوکر ہر بار آباد ہوتا رہا۔ اس وقت شہر کے چاروں طرف ایک مضبوط فصیل ہے جو ایک اندازہ کے مطابق ۸۰ء ق م میں تعمیر کیگئی تھی۔ شہر کے مرکزی دروازہ سے گذرنے کے بعد ہم ایک بازار میں داخل ہوتے ہیں جو کافی چوڑا ہے۔ اسکے دونوں طرف دکانات ہیں اور ان کی پشت پر مکانات! بازار بالکل سیدھا ہے۔ تھوڑی تھوڑی دور بعد کھلی کھلی گلیاں ہیں جو اپنی راستی اور چوڑائی کے لحاظ سے جدید شہروں کی مانند ہیں اور بڑی خوبصورت معلوم ہوتی ہیں۔ اسی بازار میں دو مندر بھی ہیں۔ ایک جینوں کا ہے جسمیں دو سر والے عقاب کی تصویر ہے اور دوسرا بدھوں کا ہے جسے توسی مندر کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ بازار کے بالکل آخر میں ایک وسیع و عریض عمارت ہے جسے مضبوطی، وسعت اور ندرت تعمیر کی وجہ سے کسی بادشاہ یا حاکم وقت کا محل تصور کیا جاتا ہے جسمیں دیوان خاص، دیوان عام اور دوسرے کمروں کی نشاندھی کے طور پر محکمہ آثار قدیمہ نے چھوٹے چھوٹے بورڈ آویزاں کر رکھے ہیں۔ بازار کی دکانات کے پیچھے مکانات زیادہ نمایاں صورت میں دریافت نہیں ہوئے۔ شاید مزید کھدائی کے وقت دیگر مکانات کے آثار اچھی حالت میں نکل سکیں۔ سرکپ ہی میں ایک طرف کچھ گہری کھدائی کیگئی جس کے نتیجہ میں نیچے چار اور شہر دریافت ہوئے ہیں۔ غالباً ایسا ہوا ہوگا کہ مختلف زمانوں میں یہ شہر تباہ ہوتے رہے اور انہیں پر نئے شہروں کو آباد کیا جاتا رہا۔ گویا سرکپ

Marfat.com

سب سے اوپر پانچواں شہر ہے۔ سرکپ کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ہزاروں سال قبل بھی شہروں کے ایسے نقشے اور نمونے ہی بنائے جاتے تھے جنہیں آج کے ترقی یافتہ دور میں پسند کیا جاتا ہے۔ شہر سرکپ کے سامنے کچھ دور کافی بلندی پر ایک عمارت دکھائی دیتی ہے۔ یہ استوپہ کناں ہے۔ کہتے ہیں کہ یہاں اندھے دعا مانگتے ہیں تو ان کی آنکھیں ٹھیک ہو جاتی ہیں۔ اس مقام سے ایک مشہور تاریخی واقعہ بھی منسوب ہے جو اپنی جگہ بہت دردناک اور لرزہ خیز ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ کناں ایک بہت خوب صورت شہزادہ تھا اسکی ایک سوتیلی ماں تھی جسے کناں سے عشق ہو گیا۔ سوتیلی ماں نے اس پر بہت سے جال پھینکے لیکن جب اس نے اِس معاملہ میں اُس کا کہنا ماننے سے انکار کر دیا تو سوتیلی ماں نے انتقام کے طور پر بڑی چالاکی سے کناں کی آنکھیں نکلوا دیں۔ باپ (راجہ) کو جب اصل صورتِ حالات کا علم ہوا تو اسے بہت صدمہ پہنچا اور اس نے اُسی وقت رانی کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ کچھ دنوں کے بعد ایک فقیر کی دُعا سے کناں کی آنکھیں درست ہو گیئں۔ یہ استوپہ اسی مقام کی یادگار ہے جہاں کناں کی آنکھیں نکلوائی گئی تھیں۔ استوپہ کے مغربی سمت ایک بہت بڑی خانقاہ ہے جو ٹیکسلا کی تمام خانقاہوں سے بڑی ہے۔

یہ مقامات دیکھنے کے بعد اب ہم عجائب خانہ دیکھنے کیلئے واپس ہوئے عجائب خانہ اسٹیشن سے آدھے میل کے فاصلے پر ہے جسکی جدید طرز کی عمارت کافی دیدہ زیب اور کافی خوبصورت ہے۔ ہال میں داخل ہوتے ہی سامنے ایک نقشہ پر نظر پڑتی ہے جسمیں ٹیکسلا کے تمام علاقوں کی نشان دھی کیگئی ہے۔ درمیان میں بڑے بڑے شوکیس ہیں جنمیں مندرجہ بالا مختلف مقامات سے برآمدہ چھوٹی چھوٹی چیزیں نہایت سلیقہ سے رکھی گئی ہیں۔ اور ہر چیز پر تعارفی چٹ موجود ہے۔ ان شوکیسوں میں یونانی، پارتھیائی اور کشانی سکے دھات، زیورات، چوڑیاں، چھلے لاکٹ

Marfat.com

انگوٹھیاں ، بالوں کے پن ، پتھر کی لقتین ، طشتریاں ، سوئیاں ، گھوڑوں کی لگامیں اور مٹی کی مہریں ، وغیرہ قابلِ دید ہیں ۔ ہال میں ہرطرف الماریاں اور میزیں ہیں جن پر پتھر اور چونے کے بُت اور مختلف اشیاء رکھی ہوئی ہیں ۔ یہ بُت اور مورتیاں دورِ قدیم کے فنِ بُت تراشی کے کمال کا مظہر ہیں ۔ یہاں آپ بہت سے بُت دیکھیں گے جو مختلف انسانی جذبات و احساسات کے صحیح آئینہ دار ہیں ۔ متعدد ایسی مورتیاں ہیں جنمیں علیحدہ علیحدہ مکمل واقعات کی ایسی تصویر کشی کیگئی ہے کہ آدمی بے ساختہ خراجِ تحسین پیش کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے ۔ لاتعداد ایسے چہرے ہیں جن کی سادگی اور حُسنِ تراشی کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے ۔

وہ دیکھیئے سامنے ایک مُورت ہے جسمیں یہ منظر پیش کیا گیا ہے ۔ کہ گوتم بدھ کے ایک رشتہ کا بھائی دیلوت جو اس کا سخت دشمن تھا ، اوپر سے ایک چٹان لڑھکا رہا ہے ۔ بُدھ پہاڑ کے سائے میں نیچے کھڑا نظر آتا ہے ۔ درمیان میں ایک دیوتا کو دکھایا گیا ہے جو اس چٹان کو بُدھ کے اوپر آنے سے روک رہا ہے ۔

ایک اور مرقع دیکھیئے جس میں دکھایا گیا ہے کہ درجۂ معرفت حاصل کرنے کے بعد بُدھ کے پاس خیرات کی چیزیں رکھنے کیلئے کوئی کاسہ نہ تھا ، چنانچہ دنیا کے چار دیوتا سونے چاندی کے کاسے پیش کرنے آئے لیکن جب بُدھ نے انہیں قبول کرنے سے انکار کر دیا تو وہ پتھر کے بنے ہوئے چار کاسے لائے جنہیں بدھ نے اپنی روحانی قوت سے ایک کاسہ بنا دیا اور قبول کر لیا ۔ ایک اور بُت میں بُدھ عالمِ استغراق میں ہے ۔ اسکی آنکھیں نیم وا ہیں اور چہرے سے کامل سکون و طمانیت جھلکتی ہے ۔ پیشانی پر اُبھرا ہوا سا گول نشان ہے جسے پدم کہتے ہیں ۔ بیان کیا جاتا ہے کہ بُدھ کے جسم پر اسی قسم کے ۳۲ نشانات تھے ۔

بُدھ کی ایک پتھر کی بنی ہوئی مُورت ہے جس کے نصف حصے پر سونے

Marfat.com

کا ملمع ہے۔ غالباً باقی حصے کا ملمع ضائع ہو گیا ہے۔ اس کے علاوہ نئی اور پرانی قسم کی دستی چکیاں، سِل بٹے اور جانوروں کی مورتیاں بھی یہاں موجود ہیں۔ ہال میں ایک طرف مٹی کے بہت سے برتن اور کھلونے بھی رکھے گئے ہیں۔ دیکھنے کی چیز وہ مٹکے ہیں جو غیر معمولی طور پر بڑے اچھے ہیں۔ اُن کے پاس ہی الماری میں پتھر، مٹی، تانبے اور کانسی کی دواتیں، دیے اور نگینے علیحدہ ہیں۔ ان چیزوں کو دیکھنے کے بعد سینکڑوں سال پہلے کی تہذیب و تمدن کے خدوخال بہت حد تک ہمارے سامنے آجاتے ہیں اور یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہمارے تمدن کی بہت سی ایسی قدریں ہیں جو آج بھی نہیں بدلیں اور ہزاروں سال گذرنے کے باوجود یہ اشیاء آج بھی مستعمل ہیں جنمیں کسی قسم کا ردّ و بدل نہیں ہوا۔ بعض چیزیں تو دیکھکر یہ احساس ہوتا ہے کہ آج ہم جن منازلِ ارتقاء کو طے کر رہے ہیں یہ لوگ بہت پہلے انہیں طے کر چکے تھے اور جن زیورات کو اس دور کی ایجاد کہا جاتا ہے انہیں بہت پہلے اِن لوگوں نے ایجاد کر لیا تھا۔ کافی دیر تک اسی قسم کے خیالات پر غور کرنے اور مختلف چیزوں کا جائزہ لینے کے بعد ہم عجائب خانہ کے ہال سے باہر نکلے۔ عمارت کے اِرد گرد پلاٹوں میں سبز گھاس کا فرش بچھا ہوا ہے۔ اور خوبصورت پھول کھلے ہوئے ہیں حسین روشوں کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں سرو کے دیو قامت درخت عجیب خوشنما منظر پیدا کرتے ہیں۔

عجائب خانہ اور کھنڈرات کی تصوراتی سیر کرانے کے بعد آیئے اب آپ کو ٹیکسلا کی قدامت اور اسکی تاریخی اہمیت کے متعلق بتائیں۔ ٹیکسلا کا اصل نام "ٹکھشلا" تھا جس کے معنیٰ ہیں "ترشے ہوئے پتھروں کا شہر"۔ بعد میں اس نام کو بھی تراشا گیا اور تبدیلی ہوتے ہوتے یہ صرف ٹیکسلا رہ گیا۔ یہ کسی زمانہ میں بڑا سرسبز و شاداب علاقہ تھا جو مختلف ادوار میں متعدد قوموں کیانی، یونانی

Marfat.com

خاندان موریہ، باختر یونانی، شاکا یا سیتھی، پارتھی یا پہلوی کشان اور راہل ہن کے زیرِ نگین رہا۔ ۳۲۶؁ قبل مسیح میں جب سکندر اعظم ہندوستان آیا تو ٹیکسلا کی وسیع مملکت کسی جنگ کے بغیر اس کے حوالے کردی گئی۔ اس وقت یہ سلطنت دریائے اٹک سے لیکر دریائے جہلم تک پھیلی ہوئی تھی۔

ٹیکسلا میں بُدھ مت کا فروغ اشوک کے زمانہ میں ہوا کیونکہ خود اس نے یہ مذہب اختیار کر لیا تھا۔ ٹیکسلا اس وقت علوم و فنون کا بہت بڑا مرکز اور بُدھ مت کا گڑھ تھا۔ یہاں بہت سی خانقاہیں تھیں جنہیں بُدھ مت کے تعلیمی مراکز کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ طلبہ یہاں سے ٹریننگ حاصل کرنے کے بعد دنیا کے ہر حصہ میں بھیجے جاتے تھے تاکہ اپنے مذہب کی تبلیغ کر سکیں۔ چوتھی صدی عیسوی تک ٹیکسلا آباد رہا۔ ۴۵۵؁ء میں وحشی ہنوں نے ہندوستان پر حملہ کر دیا اور ٹیکسلا کی اینٹ سے اینٹ بجانے کے بعد اسکی خانقاہوں اور شہروں کو نذر آتش کر دیا۔ اس عظیم تباہی کے بعد ٹیکسلا کا آفتاب ہمیشہ ہمیشہ کیلئے غروب ہو گیا۔

سالہا سال مٹی کے تودوں میں دفن رہنے کے بعد ۱۸۶۳؁ء میں پہلی مرتبہ ٹیکسلا کے آثار ظاہر ہونا شروع ہوئے اور ۱۸۷۷؁ء تک چند مقامات پر کھدائی بھی ہوئی لیکن صحیح معنیٰ میں اس پر توجہ ۱۹۱۲؁ء میں دی گئی جبکہ محکمۂ آثارِ قدیمہ نے ۲۵ سال تک باقاعدہ کھدائی کرنے کے بعد ان کھنڈرات کو محفوظ کر دیا اور یہاں سے برآمد شدہ اشیاء کیلئے ایک شاندار عجائب خانہ تعمیر کر دیا۔

یہ قدیم اشیاء آج بھی زبانِ حال سے اپنی شوکتِ رفتہ کی داستانیں دہرا رہی ہیں اور نہ جانے کتنے افسانے اور انقلابات کے خونچکاں فتنے اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں۔ اسٹیشن کے قریب ٹیکسلا آج بھی قائم ہے لیکن اب وہ "کوزہ" میں بند ہو گیا ہے ہو سکتا ہے کہ مستقبل کا کوئی بڑا انقلاب اسے ٹیکسلا کا نقشِ ثانی بنا دے شام

Marfat.com

کے وقت ہم اسسٹنٹ کیوریٹر مسٹر ریاض حسن جو بڑے خوش خلق اور ملنسار نوجوان ہیں سے رخصت ہوئے اور انکی زحمت و تکلیف کا شکریہ ادا کرنے کے بعد ٹرین سے پشاور کیلئے روانہ ہوئے

رات کو ۹ بجے ہماری ٹرین اپنی منزل مقصود پشاور چھاؤنی کے سٹیشن پر پہنچ کر ساکت ہوگئی یہی اسٹیشن ہمارا بھی منتہائے سفر بھی تھا ڈبہ سے اترتے ہی ہمیں دو اصحاب نظر آئے جو بڑی معنی خیز نظروں سے ہماری "ٹولی" کو دیکھ رہے تھے جواباً ہمارا بھی ۔۔۔ یہی ردّعمل تھا ۔ اچانک انکی نظر ہمارے دو ساتھیوں کی "ترکی ٹوپیوں" سے ٹکرائی اور وہ فوراً کچھ اندازہ کرنے کے بعد یہ کہتے ہوئے ہماری طرف بڑھے کہ "ٹرکش کیپ" دیکھنے کے بعد ہمارا یہ شک یقین میں تبدیل ہوگیا ہے کہ آپ ہی بہاولپور کے "اخبار نویس" ہیں ۔۔۔ یہ دونوں حضرات حکومت کی جانب سے ہمارے استقبال کیلئے تشریف لائے تھے ۔ ان میں ایک صاحب مسٹر رشید ڈپٹی ڈائریکٹر انفرمیشن تھے اور دوسرے مسٹر حبیب ٹورسٹ آفیسر باری باری تعارف اور مصافحہ کے ہم پلیٹ فارم سے باہر آئے ۔ جہاں دو بڑی کاریں ہمیں لے جانے کیلئے موجود تھیں ۔ ڈپٹی صاحب نے بتایا کہ آپ کو اب سروس ہوٹل لیجایا جا رہا ہے ۔ جہاں آپ کے قیام و طعام کا مکمل انتظام کیا گیا ہے ۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ ہم تو مایوس ہو گئے تھے کہ شاید آپ کا پروگرام ملتوی ہوگیا ہے ۔ اس وقت تو ہم احتیاطاً آگئے تھے ۔ اس پر جب ہم نے اُن سے پوچھا کہ آپ کو ہمارا تار نہیں ملا جو ٹیکسلا سے روانہ کیا گیا تھا ۔ تو انہوں نے نفی میں جواب دیا ۔ دوسرے دن شام کو انہوں نے بتایا کہ آپ کا ٹیلیگرام اب پہنچا ہے ۔

سروس ہوٹل میں پہنچ کر دو دو آدمیوں نے ایک کمرہ میں اپنا سامان جمایا ۔ یہ ہوٹل پشاور کے اونچے درجے کے انگلش ہوٹلوں میں دوسرا بڑا ہوٹل ہے ۔ سفر کی وجہ سے خاصے تھک گئے تھے ۔ اسلئے واجبی سا "انگریزی کھانا" کھا کر سو گئے ۔

۱۶ کی صبح کو ذرا دیر سے اُٹھے ۔ نہائے ، دھوئے ، ناشتہ کیا اور پھر رشید

Marfat.com

صاحب کے ساتھ کاروں میں بیٹھ کر پشاور شہر کی سیر کو نکل کھڑے ہوئے چھاؤنی کی شلف صاف وشفاف سڑکوں سے گذرنے کے بعد ہم شہر میں داخل ہوئے۔ کاریں بھاگ رہی تھیں اور رشیدا صاحب بتاتے جا رہے تھے وہ سیکرٹریٹ، گورنمنٹ ہاؤس، اسمبلی چیمبر، شاہی باغ، پبلک پارک اور نہ جانے کیا کیا! ان سب پر طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے پشاور کے مشہور قصہ خوانی بازار میں پہنچے۔ کہتے ہیں کہ کسی زمانہ میں بے فکرے افغان اسی بازار میں بیٹھ کر رات کو قسم قسم کے قصے کہانیاں سنایا کرتے تھے لیکن اب تو یہ بات خود ایک قصۂ پارینہ ہو چکی ہے۔ قصہ خوانی بازار خاصا کھلا ہوا اور بارونق بازار ہے جس میں ہر قسم کی دکانیں نظر آتی ہیں اور سب سے زیادہ خرید و فروخت بھی غالباً یہیں ہوتی ہے اس بازار کی ایک اور دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کے تمام "کوٹھوں" پر وکلا صاحبان بیٹھتے ہیں۔ بازار شروع ہوتے ہی "بالاخانے" شروع ہو جاتے ہیں۔

چوک یادگار پہنچکر ہم کاروں سے اتر گئے۔ یہ چوک تاریخی حیثیت رکھتا ہے سرحد میں جب آزادی کی جدوجہد اپنے نقطۂ عروج پر تھی اور پٹھان غلامی سے نجات پانے کیلئے اپنے سر دھڑ کی بازی لگاتے ہوئے تھے۔ ایک موقع پر اسی چوک میں شاندار اجتماع ہوا۔ انگریز نے جو آزادی کی اس تحریک کو بغاوت سمجھتا تھا' اپنے اقتدار کو بچانے کیلئے گولیوں کا مینہ برسا دیا۔ لوگوں نے سینہ تان کر ان گولیوں کا خیر مقدم کیا اور ایک مقدس مقصد کیلئے ان گنت رضاکار شہید ہو گئے۔ یہ چوک اسی خونچکاں حادثہ کی یادگار ہے۔ اب یہاں عموماً سیاسی و غیر سیاسی جماعتوں کے جلسے ہوتے ہیں۔ چوک یادگار دیکھنے کے بعد ہم نے مسجد مہابت خاں دیکھی۔ یہ مسجد شاہانِ مغلیہ کے زمانہ کی ہے اور اپنی خوبصورتی، مضبوطی اور مخصوص قدیم تعمیری خصوصیات کے اعتبار سے سرحد بھر میں لاجواب ہے۔ اس کے متعدد رنگین پتھروں اور نفیس کتبوں

Marfat.com

کو دیکھ کر یقین نہیں آتا کہ یہ "پرانے" ہو سکتے ہیں۔ اسی مسجد میں ایک "سرد کنواں" ہے جسمیں ہر وقت ٹھنڈا پانی رہتا ہے۔ ہم نے تجربہ کے طور پر اسمیں سے پانی نکلوا کر پیا تو واقعی اس سخت گرمی کے موسم میں وہ پانی بالکل یخ تھا۔

قصہ خوانی کے علاوہ یہاں اور بھی بہت سے بازار ہیں جنمیں جدید طرز کی دکانوں کی بھی ایک بڑی تعداد نظر آتی ہے پشاور میں بازار در بازار بھی ہیں یعنی ایک بازار میں کئی چھوٹے چھوٹے بازار ہوتے ہیں جن کے علیحدہ علیحدہ نام ہوتے ہیں ان میں سے ہر ایک کی وجہ تسمیہ موجود ہے۔ اس قسم کے بازاروں میں بازار بزازان، بازار جوتے فروشان۔ بازار صرافان اور بازار بلیٹر بازاں وغیرہ کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ یہاں وہی چیزیں فروخت ہوتی ہیں جن کے نام سے بازار موسوم کئے جاتے ہیں پشاور بڑا قدیم شہر ہے اور پاکستان کے عظیم شہروں میں شمار ہوتا ہے۔ پشاور چھاؤنی صفائی ستھرائی، چوڑی چوڑی سڑکوں، کھلے کھلے بازاروں اور نئے طرز کی عمارتوں کے اعتبار سے مثالی حیثیت رکھتی ہے۔ چھاؤنی میں تو خیر زیادہ تر تعلیم یافتہ اور سرکاری افسران رہتے ہیں لیکن پرانی آبادی (پشاور شہر) میں بھی تعلیم عام ہونے کے باعث مغربی رجحانات کو اپنایا جا رہا ہے۔ پورے پشاور کی آبادی تقریباً ۱½ لاکھ ہوگی۔ دس گیارہ سینما گھر ہیں اور مخصوص کلب بھی ہے جہاں رقص و سرود کی محفلیں جمتی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود پٹھانوں کی اکثریت کٹر قسم کی مسلمان ہے اور اسلامی اصولوں کی سختی سے پابند ہے۔ مساجد کی تعداد اگرچہ یہاں بھی کافی ہے لیکن وہ نمازیوں کیلئے ترستی نہیں بلکہ اکثر اوقات ان کیلئے ان کے دامن تنگ ہو جاتے ہیں۔ نمازیوں کی زیادتی کیوجہ سے اکثر مساجد میں دو دو تین مرتبہ نماز جمعہ ہوتی ہے۔ پردہ کا یہاں اب بھی زیادہ رواج ہے عام طور پر عورتیں گھروں سے باہر نہیں نکلتیں کیونکہ پٹھان اسے نہایت معیوب

Marfat.com

سمجھتے ہیں۔

شہروں کی سیر کرنے کے بعد دوپہر کو ہم واپس اپنے ہوٹل آگئے، شام کو ۵ بجے سرحد کے محکمہ اطلاعات کی جانب سے ہمارے اعزاز میں "ٹی پارٹی" دی گئی، جسمیں پشاور کے بعض صحافیوں کو بھی مدعو کیا گیا تھا، چائے کے ساتھ ساتھ کافی دیر تک تبادلۂ خیالات کا بھی سلسلہ جاری رہا۔ اور کچھ دیر بعد یہ محفل برخاست ہوگئی اور خیر سب چلے گئے لیکن عبداللہ شاہ صاحب ہمارے ساتھ ہی رہے جو پشاور کے ایک روزنامہ "الفلاح" کے مالک ہیں۔ بڑے جہاندیدہ ہیں اور اس بڑھاپے میں بھی بلا کے چاق و چوبند، مقطع حقطع، سیدھے سادھے مسلمان نظر آتے ہیں لیکن جدید تقاضوں کو پورا کرنے کیلئے ایک اچھی قسم کی چھوٹی سی کار بھی رکھی ہوئی ہے۔ غرضیکہ انکی شخصیت "سادگی و پرکاری" کی مکمل آئینہ دار ہے۔ باتیں بڑی دلچسپ کرتے ہیں اور اپنے پٹھانی لب ولہجہ میں بغیر فل سٹاپ کے اردو بولتے ہیں۔ باتوں ہی باتوں میں انہوں نے اپنی زندگی کے تمام اوراق ہمارے سامنے رکھدیئے اور رگی لپٹی رکھے بغیر اپنے متعلق تمام اچھی بُری باتیں سناڈالیں۔ وہ بڑی بے تکلفی سے اپنے ماضی وحال کے کردار کے روشن پہلو دکھا رہے تھے۔ اور ہم انکی اس صاف گوئی پر اُن کا مُنہ تک رہے تھے۔ آخر میں انہوں نے سرحد میں اخبار نویسوں کیلئے حکومت کی مراعات کا ذکر کیا۔ اس موقع پر ہمارے ایک ساتھی جو ایک شان بے نیازی سے الگ تھلگ بیٹھے تھے ایکدم چونکے اور ہمہ تن گوش ہوگئے۔ یہاں تک کہ "مراعات کی تفصیلات" سے ان کی دلچسپی اور انہماک اتنا بڑھ گیا کہ انہیں ہمارے اشاروں اور سرگوشیوں کی بھی خبر نہیں ہوتی تھی۔ یہ دیکھ کر ہمارے ایک منہ پھٹ دوست سے نہ رہا گیا اور آخر انہوں نے کہہ دیا "شاہ صاحب! خدا کیلئے مزید تفصیل نہ بتائیے ورنہ ہمارا ایک

Marfat.com

ساتھی یہیں رہ جائے گا" ایک زبردست فرمائشی قہقہہ بلند ہوا اور گفتگو کا سلسلہ ختم ہو کر رہ گیا۔ اس کے بعد شاہ صاحب ہمیں چھاؤنی کی پیدل سیر کرانے کیلئے لیکر چلے راستہ میں انہوں نے اپنا دفتر بھی دکھایا اور شربت اور آئس کریم سے ہماری تواضع کی۔ دوسرے دن ان کے ہاں اس دعوت کی خبر "ہیڈ لائن" میں شائع ہوئی۔

درّہ خیبر کو روانگی:

۷ار تاریخ کو ہماری پارٹی درّہ خیبر روانہ ہوئی۔ کچھ فاصلے طے کرنے کے بعد ایک چوکی پر ہماری کاریں رُک گئیں۔ لوڑسٹ آفیسر ہمراہ تھے۔ اُن کی ہدایت کے مطابق کیمرے یہیں رکھ دیئے گئے۔ کیونکہ درہ خیبر کے فوٹو لینے کی ممانعت ہے۔ داخلہ کا پرمٹ دکھانے کے بعد گیٹ کھل گیا اور ہم قبائلی علاقہ میں داخل ہو گئے جہاں قانون ایک مہمل لفظ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا اور جرائم کے ارتکاب میں کسی کو عار نہیں۔ یہاں نہ کوئی حکومت ہے۔ نہ پولیس نہ فوج ہے اور نہ عدالت! پورا علاقہ ایک آزاد قوم کے قبضہ میں ہے جس پر حکومت کے کسی حکم اور کسی پابندی کا اطلاق نہیں ہوتا۔ وہ جو چاہیں کریں اور جس طرح چاہیں رہیں۔ انہیں کوئی روکنے والا نہیں۔ کیونکہ آزاد طبیعت کسی مداخلت کو برداشت نہیں کرسکتی۔ اس قوم کے چند سردار ہیں جو بہت حد تک سیاہ و سفید کے مالک ہوتے ہیں۔ حکومت کسی قسم کی گفت و شنید کرنے یا معاونت کیلئے انہیں سے رابطہ پیدا کرتی ہے۔ راستہ میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر قبائلیوں کے چھوٹے چھوٹے گاؤں نظر آتے ہیں۔ اکیلا مکان کوئی نہیں ملتا۔ یہ لوگ علیحدہ علیحدہ رہنا پسند نہیں کرتے۔ ہمیشہ ملکر رہتے ہیں چنانچہ آپ یہاں ہر جگہ ایسے بڑے بڑے گھر دیکھیں گے جن کے چاروں طرف اونچی اونچی دیواریں ہوئی ہیں اور ان میں کئی کئی خاندان اکٹھے رہتے ہیں۔ ہر مکان میں مینار کی شکل کا ایک خاصہ بلند مورچہ ہوتا ہے۔ جب یہ لوگ آپس میں لڑتے ہیں یا کوئی قبیلہ دوسرے پر

Marfat.com

حملہ آور ہوتا ہے تو اس مورچہ سے اپنے گاؤں یا مکان کا دفاع کیا جاتا ہے۔ ان مورچوں میں چاروں طرف طاق سے بنے ہوتے ہیں جن میں بندوق رکھکر یہ لوگ فائر کرتے ہیں۔ عام طور پر یہاں مرد بیکار رہتے ہیں اور اسلحہ لئے پھرنے کے علاوہ اور کوئی کام نہیں کرتے لیکن اب کچھ عرصہ سے حکومتِ پاکستان سے تعلقات بہتر ہونے کے بعد وہ تجارت کی طرف مائل نظر آتے ہیں اور حکومت کی تعلیمی پالیسیوں سے بھی استفادہ کر رہے ہیں۔ جہاں کہیں ہموار دکار آمد زمین ہے وہاں کاشت بھی ہوتی ہے۔ اور کاشتکاری کا کام عورتیں انجام دیتی ہیں۔ قبائلی عورتیں بہت جفاکش اور محنتی ہوتی ہیں۔ اور گھر سے لیکر باہر کی تمام ضروریاتِ زندگی کی تکمیل انہی کے ذمہ ہوتی ہے۔ وہی دور دور سے پانی لاتی ہیں۔ وہی پہاڑوں پر سے لکڑیاں چنتی ہیں اور وہی گھر کے تمام کام کاج کرتی ہیں۔ یہاں مرد زیادہ تر خاکی لباس پہنتے ہیں اور عورتیں سیاہ کپڑوں میں ملبوس نظر آتی ہیں۔ جنسی بے راہ روی بہت کم ہے۔ پردہ نہیں ہے لیکن عورتوں میں شرم وحیا بدرجہ اتم موجود ہے۔ کہتے ہیں اگر کوئی بدیسی قبائلی عورت سے جنسی تعلقات پیدا کرلے تو دونوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔ اگرچہ قبائلیوں کو جہالت کے باعث اسلام سے پوری طرح واقفیت نہیں لیکن وہ راسخ العقیدہ مسلمان ہیں۔ ان کے ہاں باقاعدہ نکاح ہوتے ہیں اور لڑکی کے بدلے اچھی خاصی رقم وصول کیجاتی ہے اسکی ایک بڑی وجہ غربت بھی ہے۔ ان لوگوں کا سکہ علیحدہ ہے جسے افغانی سکہ کہا جاتا ہے۔ پاکستان کا ایک روپیہ سات افغانی روپوں کے برابر ہوتا ہے۔

خیبر ایجنسی میں ہر جمعہ کو ایک میلہ ہوتا ہے جسمیں مختلف اشیا کی خرید وفروخت ہوتی ہے اور ایک حد تک عیاشی کو بھی روا رکھا جاتا ہے۔

مختلف مقامات اور بستیوں سے گذرتے ہوئے ہم پاکستان اور افغانستان

Marfat.com

کی سرحد سے قریب ہوتے جارہے تھے۔ تارکول کی عمدہ ترین سڑک پر ہماری کاریں بڑی تیزی سے دوڑ رہی تھیں۔ درہ خیبر کا وسیع سلسلہ شروع تھا۔ کہیں چڑھائی تھی اور کہیں ہموار زمین۔ سڑک کے اردگرد اونچے اونچے پہاڑوں کو کاٹ کر سڑک بنانا واقعی ایک عظیم کام تھا اور ہمیں اعتراف کرنا چاہیے کہ انگریزوں نے اسے انجام دیکر ہماری بے پناہ مشکلات ختم کردیں۔ اس سڑک کی تعمیر کیلئے انہوں نے بیشمار جانی و مالی قربانیاں بھی دیں کیونکہ قبائلی انگریزوں کے دشمن تھے۔ اسلیئے انہوں نے سڑک بنانے کی بھی مخالفت کی اور باقاعدہ جنگیں لڑیں۔ گولیاں برسائیں۔ بم برسے اور سینکڑوں آدمی موت کے گھاٹ اتر گئے۔ سڑک کے دائیں بائیں اب بھی تھوڑی تھوڑی دور کے فاصلے پر کتبے لگے ہوئے ہیں۔ جو انگریز معماروں کی موت کی یادگار بھی ہیں چونکہ درہ خیبر ایک اہم ترین سرحدی علاقہ ہے اسلیئے یہاں مکمل حفاظتی انتظامات کئے گئے ہیں۔ بے شمار سرنگیں ہیں اور ہر پہاڑ کی چوٹی پر ایک "پکٹ" موجود ہے۔ راستہ میں ایک شاندار عمارت ہے جسے قلعہ خیبر کہتے ہیں اور اس میں پاکستانی فوج رہتی ہے۔ پہاڑیوں کا ایک طویل سلسلہ اور پیچ در پیچ سڑک عبور کرنے کے بعد پاکستان و افغانستان کی سرحد سے بیس قدم ادھر ہماری کاریں ٹھہر گئیں۔ اس جگہ کا نام طورخم ہے اور پشاور سے ۴۲ میل کے فاصلے پر ہے۔

تارکول کی سڑک یہاں ختم ہوجاتی ہے اور سامنے افغانستان کی کچی سڑک دکھائی دیتی ہے۔ درمیان میں ایک زنجیر ہے۔ دونوں ملکوں کی حد قائم کیگئی ہے ادہر پاکستانی سپاہی کھڑا ہے اور دوسری طرف افغانستانی۔ بائیں طرف پہاڑ ہے جس پر پانی گرنے سے ایک سفید سی لکیر بن گئی ہے۔ دونوں حکومتوں نے اس قدرتی حدبندی کو تسلیم کر رکھا ہے۔

اس طرف پاکستان کا چیکنگ آفس ہے اور دوسری طرف افغانستان کا یہاں

Marfat.com

مسافروں کے پاسپورٹ اور سامان کی پڑتال کیجاتی ہے۔ قبائلیوں کیلئے کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ وہ بلا پرمٹ آجا سکتے ہیں

وارسک اسکیم : تھوڑی دیر یہاں ریسٹ کرنے کے بعد یہاں سے ہم وارسک اسکیم دیکھنے کیلئے روانہ ہوئے۔ سڑک کچی تھی۔ اسلئے مٹی نے اڑکر ہمارے چہروں پر غازہ کا کام کیا۔ جوں توں کر کے ہچکولے کھاتے ہوئے ہم آخر اس جگہ پہنچ گئے جہاں وارسک پروجیکٹ کو عملی جامہ پہنانے کا کام جاری ہے۔ گرمی کے مارے ہمارا برا حال ہوگیا۔ جلد ہی ہمیں ایک بڑی سرنگ میں داخل کیا گیا جو اس پروجیکٹ کا ہی ایک اہم جزو ہے۔ یہ سرنگ پہاڑ کو ڈائنامیٹ سے کاٹ کر بنائی ہے اور اس میں روشنی اور ہوا کا شاندار انتظام ہے۔ جونہی ہم سرنگ میں داخل ہوئے، ہمیں محسوس ہوا جیسے ہم جہنم سے نکل کر جنت میں آگئے ہیں کیونکہ یہاں کافی ٹھنڈ تھی اندر ایک کافی بڑا ہال ہے جہاں تجربہ کیا جائے گا کہ جنریٹر لگنے کے بعد کہیں یہ چھت نیچے تو نہیں آپڑیگی۔ اس قسم کے اور چھوٹے چھوٹے کمرے بھی ہیں۔ اسی سرنگ میں ایک طرف نیچے کھدائی کیگئی ہے۔ اب تک ۱۷۵ فٹ کے قریب کھدائی ہو چکی ہے۔ پروگرام یہ ہے کہ ایسے کچھ کھود کر دریا کے نیچے سے ایک سرنگ نکالی جائے۔ سرنگ سے باہر نکلے تو دریائے کابل کو زور شور سے بہتے ہوئے دیکھا۔ کابل ہی کے پانی کو استعمال کرنے کیلئے وارسک پروجیکٹ تیار کیا جا رہا ہے۔ پروجیکٹ کی تکمیل کے بعد اس سے ڈیڑھ لاکھ کلوواٹ بجلی پیدا ہو سکے گی۔ اور سرحد کا ۹۴ ہزار ایکڑ بنجر رقبہ آباد ہو جائے گا۔ حکومتِ پاکستان نے اس پروجیکٹ کو منظور کر دیا ہے۔ اور حکومتِ کینیڈا بھی اس کیلئے ضروری سامان بھیجنے پر رضامند ہوگئی ہے۔ وارسک کا معائنہ کرنے کے بعد ۲ بجے پشاور پہنچے۔ تین گھنٹے آرام کیا اور شام کو روڈ ٹرانسپورٹ ایمپلائز یونین" کی جانب سے منعقدہ دعوت چائے میں شریک ہوئے

Marfat.com

جو "گرین ہوٹل" میں دی گئی تھی۔ مختلف میزوں پر بہت سے حضرات ہمارے منتظر تھے چنانچہ ہم سب ایک جگہ بیٹھنے کی بجائے منتشر ہو گئے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کے ساتھ تبادلہ خیال ہو سکے۔ گپتوں کا سلسلہ جاری تھا کہ سیکرٹری صاحب نے سپاسنامہ شروع کر دیا جسمیں لمبی چوڑی بات کرنے کی بجائے انہوں نے نہایت مختصر مگر جامع الفاظ میں ہمارا خیر مقدم کیا اور اپیل کی کہ صحافیوں کو ان کی یونین کے مقاصد کی تکمیل کیلئے تعاون کرنا چاہیئے۔ ایسے موقعوں پر جوابی تقریر کرنے یا اور دوسرے معاملات طے کرنے کیلئے صحافیانِ بہاولپور نے شہاب دہلوی کو اپنا "پارٹی لیڈر" منتخب کیا تھا چنانچہ اس موقع پر پارٹی کی طرف سے یونین کے جائز مطالبات کی حمایت کا یقین دلانے کے بعد انہوں نے یونین کے عہدیداروں کے خلوص اور دعوت کا شکریہ ادا کیا۔ اس کے بعد ایک صاحب نے "مزدور" کے عنوان سے نظم سنائی جو ان کے ترنم سے زیادہ اچھی تھی۔ ایک اور خان صاحب نے اسی موضوع پر بڑی جذباتی تقریر کی جس سے محفل گرما گئی۔ اس کے بعد سب گرما گرم چائے کی پیالیوں پر جھک گئے۔ تقریباً ایک گھنٹہ بعد دعوت کا اختتام ہوا اور ہم یونین والوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے رخصت ہوئے

مدیر ترجمان افغان مسٹر احقر سرحدی کی تجویز کیمطابق ہم نے کاریں چھوڑ دیں اور انکی رہنمائی میں شہر کی پیدل سیر شروع کر دی۔ ضرورت کی تھوڑی سی چیزیں خریدیں۔ روزنامہ شہباز کا دفتر دیکھا۔ روزنامہ "ہمارا پاکستان" کے دفتر میں گئے وہاں لیمن کی بوتلیں پیں پھر احقر صاحب ہمیں اپنے دفتر لے گئے اور پٹھانوں کی مرغوب چیز قہوہ پلایا۔ ۸ بجے ہم نے صابر ہوٹل کا رخ کیا کیونکہ وہاں احقر صاحب نے ہمارے اعزاز میں "تکا پارٹی" کا اہتمام کیا تھا۔ اس پارٹی میں پشاور کے تقریباً تمام صحافی شریک تھے۔ ہلالی صاحب مدیر جمہوریت نے مقامی صحافیوں کی جانب سے ہمیں خوش آمدید کہا اور شہاب دہلوی

Marfat.com

اور شیخ فضل کریم صاحب نے جواباً پشتو میں الفاظ میں شکریہ ادا کیا۔ اور دعوت دی کہ وہ بھی کسی پہلی فرصت میں بہاولپور تشریف لائیں۔ اس کے بعد بڑے بڑے نان اور سیخ کے کباب آ گئے اور ہر شخص کے سامنے تکوں کی ایک ایک بڑی پلیٹ رکھ دی گئی۔ یہ تکے سرحد کی خاص چیز ہوتے ہیں۔

کوہاٹ اور بنوں:

بنوں کیلئے ہم ۱۸ جولائی کو صبح ۶ بجے روانہ ہوئے چند ہی میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہم قبائلی علاقہ میں داخل ہو گئے "درہ" میں ہماری کاریں ٹھہر گئیں۔ یہ ایک بارونق قصبہ ہے اور اس کے بازار میں خاصی چہل پہل رہتی ہے۔ اسلحہ کی کئی دکانیں ہیں جن میں مختلف قسم کے اسلحہ جات رکھے ہوئے نظر آتے ہیں یہیں ایک پرائیویٹ اسلحہ فیکٹری بھی ہے جسمیں رائفل، ریوالور، اسٹین گن، پستول اور بندوقیں وغیرہ تیار ہوتی ہیں۔ اس فیکٹری کی تیار کردہ چیزیں جب ہم نے دیکھیں تو حیران رہ گئے کیونکہ یہ اتنی عمدہ اور بناوٹ کے اعتبار سے ظاہری طور پر اتنی خوب صورت ہوتی ہیں کہ عام آدمی کیلئے تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ دیسی ہیں یا ولایتی ایک پسٹل پر Made in Germany دیکھ کر ہم نے سوالیہ نگاہوں سے فیکٹری کے مالک کی طرف دیکھا تو وہ جواب میں مسکرا دیا۔ اور ہم سمجھ گئے کہ نقل کو اصل بنانے کے حربے یہاں بھی پہنچ گئے ہیں۔ اصل صورت میں اچھے سے اچھا دیسی مال خریدنے کو کوئی تیار نہیں ہوتا لیکن اگر اسی مال کو ولایتی بنا دیا جائے تو ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو جاتا ہے۔

فیکٹری میں داخل ہونے سے پہلے، ہمارا خیال تھا کہ اس میں بڑی بڑی مشینیں نصب ہونگی۔ بے شمار کاریگر ہونگے اور شور کی وجہ سے کان پڑی آواز سنائی نہیں

Marfat.com

دیتی ہو گی لیکن جب ہم فیکٹری پہنچے تو ہمارے یہ سارے خیال خواب وخیال ہی ثابت ہوئے۔ نہ وہاں مشینیں تھیں، نہ بے شمار کاریگر اور نہ شور! چند آدمی معمولی سامان کے ساتھ کام کر رہے تھے۔ اگر آپ اس فیکٹری میں کام ہوتا ہوا دیکھیں اور سامان کا موازنہ کریں تو یقین نہیں کر سکتے کہ یہاں اتنے عمدہ ہتھیار بنتے ہیں۔ قبائلی علاقہ میں اسلحہ وغیرہ کیلئے لائسینس کی ضرورت نہیں، اسلئے ہر شخص کے پاس رائفل یا پسٹل ہوتا ہے۔ اس علاقہ میں بڑے بڑے نشانچی ہوتے ہیں یہاں تک کہ چھوٹے چھوٹے بچے اڑتے ہوئے پرندوں کا شکار کر لیتے ہیں۔

فیکٹری دیکھنے کیبعد جب ہم بازار میں آئے تو خربوزوں کا ڈھیر دیکھ کر ہمارے دوستوں کی رال ٹپک پڑی۔ سردے جیسے بڑے بڑے خربوزے قیمت کم اور مٹھاس زیادہ! خوب سیر ہو کر کھائے۔ اور اس کے بعد قریب ہی ایک دکان میں چائے کا دور چلا۔ پیسے دینے لگے تو دکاندار نے ایک صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "آپ زحمت نہ کیجئے۔ ان صاحب نے پیسے دے دیئے ہیں۔"

"ارے بھائی کیسے! ہم تو ان سے متعارف بھی نہیں" یہ باتیں سن کر وہ صاحب بھی آگئے۔ تعارف کے بعد ہم نے اُن کی اس غائبانہ پُرخلوص دعوت کا شکریہ ادا کیا۔ اور روانہ ہو گئے۔ بہادر خیل کے قریب سپید نمک کے پہاڑ ہیں جو صوبہ سرحد کی ضرورت پوری کرنے کیلئے بہت حد تک کافی ہیں پشاور سے ایک سو چار میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد دوپہر کے وقت ہم بنوں پہنچے جہاں ڈاک بنگلہ پر اسسٹنٹ کمشنر عبدالرزاق صاحب نے ہمیں خوش آمدید کہا۔

لنچ کھایا ہی تھا کہ ایس۔ ڈی۔ او (غالباً عین اللہ خاں صاحب) آ گئے جنکی معیت میں ہم کرم گڑھی پراجیکٹ دیکھنے کیلئے روانہ ہو گئے۔ بنوں سے آگے پھر قبائلی علاقہ شروع ہو جاتا ہے جسے وزیرستان کہتے ہیں۔ قبائلیوں کا گڑھ

Marfat.com

اور سب سے زیادہ مضبوط مرکز بھی جگہ ہے ۔ اسلئے اسے خطرناک ترین علاقہ سمجھا جاتا ہے ۔ چنانچہ ہماری حفاظت کیلئے آگے آگے ایک سرکاری جیپ میں مسلح گارد تھی ۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ احتیاطی تدابیر تھیں ورنہ آجکل اس کی چنداں ضرورت نہیں ۔ قبائلی انگریزوں کے سخت دشمن تھے ، اور یہاں یہ روایت کافی مشہور ہے کہ وہ جس کسی کو ہیٹ پہنے دیکھتے اُن پر گولی چلا دیتے تھے ۔ قبائلیوں کا پیشہ عام طور پر زراعت یا لوٹ مار ہے ۔ لیکن ہمیں بتایا گیا کہ اب یہ آہستہ آہستہ مہذب بن رہے ہیں ۔ انمیں تعلیمی ذوق و شوق بڑی تیزی سے فروغ پا رہا ہے ۔ جس کے نتیجہ میں متعدد قبائلی نوجوان گریجوایٹ بننے کے بعد سرکاری ملازمتیں اختیار کر رہے ہیں ۔ قبائلیوں کی ڈاکہ زنی اور سفاکی کی روایات جہاں مشہور ہیں وہاں ان کی مہمان نوازی ، روا داری اور خودداری بھی ضرب المثل ہے ۔ یہ لوگ جب کسی کو پناہ میں لے لیتے ہیں تو اس سے دغا نہیں کرتے اور اس کیلئے جانیں لڑا دیتے ہیں ۔ اپنے مہمان کی تواضع میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے ۔ اور ضرورت ہو تو قیمتی بکرا یا اونٹ قربان کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے ۔ اور سب سے بڑھکر یہ کسی قیمت پر بھی اپنی خودداری کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے ۔ انہیں سر کٹانا منظور ہے لیکن غلامی منظور نہیں ۔ بالفاظِ دیگر وہ آزادی کو زندگی اور غلامی کو موت سمجھتے ہیں ۔ مشہور واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ ـــ تیمور نے قبائلیوں کے تمام علاقے کا محاصرہ کر لیا ۔ چاروں طرف اپنی لاتعداد فوج پھیلا دی اور رسل و رسائل کے تمام ذرائع مسدود کر دیئے ۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قبائلی بھوکوں مرنے لگے ۔ کئی ماہ گذر گئے ۔ قبائلیوں کی پریشانیاں حد سے زیادہ بڑھتی گئیں ۔ اشیائے خورد و نوش ختم ہو گئیں اور قحط کا یہ عالم ہو گیا کہ لوگ گھاس ، پتے ، مٹی اور جانور کھانے لگے ۔ تیمور نے ہتھیار ڈال دینے کیلئے کہا

Marfat.com

لیکن انہوں نے صاف جواب دے دیا کہ جب تک ایک قبائلی بچہ بھی زندہ ہے ہم محکوم ہونا پسند نہیں کرینگے۔ ہم گھاس اور مٹی کھا کر مر سکتے ہیں لیکن غلام نہیں بن سکتے۔ یہ خالی دعویٰ ہی نہیں تھا حقیقت بھی یہی تھی، چنانچہ تیمور کو اپنا خیال بدلنا پڑا

انگریزوں نے پٹھانوں کو ہمیشہ انتہائی غلط رنگ میں پیش کیا اور انہیں خونخوار و وحشی قوم ثابت کرنے کیلئے اتنی مبالغہ آمیز داستانیں تخلیق کیں کہ مہذب دنیا" اُن سے متنفر ہو گئی۔ ان کی زندگی کے تاریک پہلوؤں کو اس قدر اُجاگر کیا کہ انکا اعلیٰ کردار دب کر رہ گیا۔ اور انکی خصوصیات و محاسن پر لاعلمی کی دبیز تہیں جم گئیں۔ لیکن اب رفتہ رفتہ اجنبیت و نفرت کے یہ پردے اُٹھ رہے ہیں غیر ممالک سے آنیوالے سیاح جب اپنی آنکھوں سے ان لوگوں کی عادات و اطوار، بود و باش اور تہذیب و تمدن کو دیکھتے ہیں تو وہ اپنی رائے بدلنے پر مجبور ہو جاتے ہیں جو جانبدار انگریز مورخوں کی کتابیں پڑھنے کے بعد انہوں نے قائم کی تھی۔

اگرچہ قبائلیوں سے پاکستان کے تعلقات اب کافی خوشگوار ہیں لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ حکومت انہیں پوری طرح اپنے اعتماد میں لے آئے اور انہیں ایسی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں کہ ان کا معیارِ زندگی بلند ہونے لگے۔ اگر حکومت اس طرف خصوصی توجہ مبذول کرے اور ان لوگوں سے معاملات طے کرنے کیلئے بعض بااثر اشخاص کی خدمات حاصل کر لی جائیں۔ تو یہ کام زیادہ مشکل نہیں اگر اس سلسلے میں پاکستان کی کوششیں کامیاب ہو جائیں تو اسے مفت میں کئی لاکھ " آزاد فوج" مل جائے گی۔

بنوں سے ۸ میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہم کرم گڑھی پہنچے۔ یہاں سے دریائے کرم کا گذر ہے جس کے پانی کو کار آمد بنانے کیلئے جنوری ۱۹۲۱ء میں کرم گڑھی پراجیکٹ

Marfat.com

کا کام شروع کیا گیا تھا۔ یہ پراجیکٹ دو سال کے بعد ۱۹۵۶ء میں مکمل ہوگا۔ اور اس پر تقریباً ۴ کروڑ روپے خرچ ہونگے۔ پروجیکٹ کی تکمیل کے بعد صنعتی و نجی ضروریات کیلئے ۴۰۰۰ کلوواٹ بجلی پیدا ہوگی۔ اور تین لاکھ ایکڑ زمین سیراب ہوگی۔ پروجیکٹ کا خرچ نصف حکومت سرحد اور نصف حکومت پاکستان برداشت کر رہی ہے یہاں ایک بند کی تعمیر ہو رہی ہے جس میں سے ۵۰ میل لمبی ایک نہر نکالی جائیگی۔ دو پاور ہاؤس بنائے جائیں گے۔ ۴۶-۴۶ فٹ کی دو آبشاروں سے بجلی پیدا کیجائیگی۔ پروجیکٹ دیکھنے کیبعد ہمیں ریسٹ ہاؤس لے جایا گیا جو ہمیں خاصی بلندی پر تعمیر کیا گیا ہے۔ یہاں ہم نے ایک "ٹی پارٹی" اڑائی اور اس کے بعد واپس روانہ ہوئے۔ راستہ میں ہم نے "بارانی ڈیم" پر کام ہوتا دیکھا۔ یہاں بارش کے پانی کا ذخیرہ کیا جائے گا۔ تاکہ قلتِ آب کے وقت اسے استعمال کیا جائے۔

یہ منصوبے مکمل ہو جانے کےبعد قبائلیوں کی زراعتی ترقی میں خاطر خواہ اضافہ ہوگا۔ بنوں پہنچنے کےبعد شام کو ہم نے "بنوں وولن مل" دیکھی۔ مل کی عمارت اچھی ہے جب ہم اندر داخل ہوئے تو اگرچہ کام بند تھا لیکن بڑی سخت گرمی تھی۔ جنرل مینجر صاحب نے جلدی جلدی ہمیں مشینیں دکھائیں۔ اور اونی کپڑا بنانے کے مختلف مدارج کا معائنہ کرایا۔ فی الحال یہ مل کمبل اور تاگہ تیار کر رہا ہے جسکی کھپت سرحدی فوج اور ہسپتالوں میں ہوتی ہے

متعدد سوالوں کے جواب میں جنرل مینجر صاحب نے بتایا کہ مل اگرچہ ایک سال سے جاری ہے لیکن صحیح معنوں میں پندرہ دنوں سے کام شروع ہوا ہے۔ ابھی تو کچھ نقصان ہے لیکن ستمبر ۵۴ء تک اپنے اخراجات کی کفالت کرنے کے علاوہ اچھا منافع بھی دے سکے گی۔ اس مل پر حکومتِ سرحد نے تقریباً ۶۰ لاکھ روپے خرچ کئے ہیں۔ کاروبار منفعت بخش ثابت ہونے پر اس کے حصص عوام کے ہاتھ فروخت کر

Marfat.com

دیے جائیں گے۔ انہوں نے کہا کہ اس پل کی وجہ سے سرحد کی تمام اوُن کار آمد ہو جائے گی۔ بلکہ مزید مزدورت ہو گی۔ اس کے علاوہ مزدوروں کی حیثیت سے قبائلی کسی حد تک باروزگار ہو جائیں گے اور اِن کے علاقہ میں اوُن کے سنٹر قائم ہونے سے اِن کی مالی حالت بھی درست ہو جائے گی۔ چلتے وقت شربت رُوح افزا سے ہماری تواضع کیگئی۔ پل دیکھنے کے بعد ہم نے کاروں پر شہر بنوں کا ایک چکر لگایا کھلے کھلے بازار اور چوڑی چوڑی سڑکیں، شہر کے باہر سڑکوں پر دو رویہ روشیں نہایت حسین اور خوشنما معلوم ہوتی ہیں۔ ہر جگہ صفائی ستھرائی نظر آتی ہے۔ چھاوُنی سمیت بنوں کی آبادی ۲۵ ہزار کے قریب ہے۔ ایک ہزار غیر مسلم ہیں۔ اُن میں ۹۵ ہندو اور باقی عیسائی ہیں۔ رات کو ڈپٹی کمشنر صاحب سے ملاقات ہوئی اور کافی دیر تک تبادلہ خیالات ہوتا رہا۔ رات کو بنوں میں ہی قیام تھا۔ جب ہم ڈاک بنگلے پہنچے تو کھانا بھی تیار تھا۔ اور بستر بھی! کھانے سے فارغ ہونے کے بعد ہم اپنے بستروں میں پہنچے ہی تھے کہ مشاعرہ کا بلاوا آ گیا۔ یہ مشاعرہ ہمارے اعزاز میں ڈاک بنگلہ ہی میں منعقد کیا جا رہا تھا۔ اور اس کے بانی سرور سلیمانی اور ایک ڈاکٹر صاحب تھے جنکی شخصیت گوناگوں دلچسپیوں کی حامل تھی۔ سرور ماسٹر بھی ہیں اور صحافی بھی۔ وہ تمام دن ہمارے ساتھ رہے۔ اور انتہائی مخلصانہ طور پر ہمیں سہولتیں بہم پہنچاتے رہے۔ تھکے ہوئے ہونے کے باوجود ان کا کہنا نہ ٹال سکے۔ صدارت کا قرعہ فال شیخ فضل کریم صاحب کے نام نکلا۔ اور مشاعرہ "شروع" ہو گیا۔ تین شاعر بنوں کے تھے اور تین شاعر ہمارے۔ کئی دور چلے خلاف توقع یہ محفلِ مشاعرہ کافی کامیاب رہی۔ مشاعرہ کی رونق یا دلچسپی ڈاکٹر صاحب کی ذات تھی۔ جنکی "داد" کی داد دینی پڑتی ہے۔ وہ جب داد دیتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ وہ اکیلے نہیں بلکہ ایک بڑا مجمع داد دے رہا ہے۔ یہ سلسلہ کئی گھنٹے تک جاری رہی۔ اور اس کے بعد ہم نیند کی

Marfat.com

آغوش میں چلے گئے

۱۹ جولائی کو والیس لپٹ ور روانہ ہوئے۔ راستہ میں کوہاٹ دیکھا۔ شہر کے چاروں طرف دروازے ہیں۔ ایک خاصہ بڑا بازار ہے جسمیں سلیقہ سے سجی ہوئی ہر قسم کی دکانیں ہیں۔ یہاں سے ایک اخبار "ہمدم" نکلتا ہے جن کے ایڈیٹر صاحب سے اتفاقیہ ملاقات ہو گئی۔ انہوں نے شربت وغیرہ پیش کیا اور ہم نے بلا تکلف قبول کر لیا۔ کوہاٹ میں ایک چشمہ ہے جسمیں سے نہایت ٹھنڈا پانی نکلتا ہے۔ شہر والوں کیلئے یہ چشمہ نعمتِ غیر مترقبہ ہے۔

دو دن تک باہر رہنے کے بعد ۲ بجے کے قریب ہم پھر اپنے ہیڈ کوارٹر پشاور پہنچ گئے۔ شام کو ۵ بجے گرین ہوٹل میں ادارہ "روزنامہ شہباز" کی دعوت چائے میں شرکت کی۔ رات کو روزنامہ "ہمارا پاکستان" والوں نے صابری ہوٹل میں تکہ پارٹی" دی جس میں تقریباً ۵۰ صحافی اور معززین شہر شامل ہوئے۔

"خیر مقدم" کے عنوان سے ایک نظم پڑھی گئی جو نہایت مرصع تھی۔ پشاور میں ہماری یہ آخری دعوت تھی اس لئے کافی دیر تک گپیں، باتیں اور تبادلۂ خیالات ہوتا رہا۔ آخر میں راقم الحروف نے الوداعی تقریر کی اور سرحد والوں کا شکریہ ادا کرنے کے بعد صحافیوں کو ایک بار پھر دعوت دی کہ وہ ضرور بہاولپور آئیں۔ اس پُرخلوص دعوت کے اختتام کے بعد ہم محبت و اخوت سے لبریز دلوں کیساتھ رخصت ہوئے اور اپنی قیام گاہ سروس ہوٹل میں رات کو آرام کیا۔

Marfat.com

نوشہرہ۔ مردان۔ کشمیر پوائنٹ
اور ریاست سوات :

۲۰ جولائی کو صبح ہم پشاور مالکنڈ ہائیڈل اسکیم دیکھنے روانہ ہوئے۔ اس وقت تک ریاست سوات کی سیر ہمارے پروگرام میں شامل نہ تھی۔ لیکن سرحدی صحافیوں اور دوسرے اصحاب نے بیحد اصرار کیا کہ ریاست سوات ضرور دیکھی جائے ورنہ دورہ سرحد قطعی نامکمل رہے گا۔ ہم بھی دودھ اور شہد کی اس سرزمین کو دیکھنے کے متمنی تو پہلے ہی سے تھے۔ ان لوگوں کے اس اصرار نے کمند شوق پہ "تازیانہ" کا کام کیا۔ چنانچہ سرحد کے ڈپٹی ڈائریکٹر انفرمیشن مسٹر رشید انے والیٔ سوات کو سیرِ سوات کی اجازت لینے کیلئے فون کردیا۔ اور ہمیں کہا کہ جواب آنے پر جہاں کہیں آپ ہوں گے، اطلاع مل جائے گی۔

پشاور سے روانہ ہونے کے بعد راستہ میں سب سے پہلے ہم نوشہرہ رکے، یہاں ہم نے چمڑے کا کارخانہ دیکھا جو ۱۹۵۰ء میں ۲۲ لاکھ روپے کے صرف سے قائم ہوا تھا۔ اس وقت اسمیں ۱۲۳ مزدور کام کرتے ہیں۔ منیجر صاحب کی رہنمائی میں جونہی ہم کارخانہ میں داخل ہوئے۔ ایک زبردست سڑی ہوئی بدبو نے ہمارا خیر مقدم کیا۔ مولوی درویش صاحب تو تاب نہ لاکر الٹے پاؤں ہی دروازے سے باہر نکل گئے۔ پوری عمارت میں جانوروں کی کھالوں کی بدبو رچی بسی ہوئی تھی جس سے ناک پھٹی جاتی تھی۔ ناک پر رومال رکھے ہوئے ہم نے جیسے تیسے کھالوں کی دھلائی، صفائی، رنگائی اور پریسنگ کا کام دیکھا اور اس طرح باہر نکلے جیسے کوئی قیدی جیل سے نکلتا ہے۔ منیجر صاحب نے ٹھنڈے پانی یا شاید شربت سے ہماری تواضع کی اور ہم آگے روانہ ہوگئے۔ رسالپور کی فوجی چھاؤنی دیکھتے ہوئے ہم جلد ہی مردان شوگر ملز پہنچ گئے جو ایشیا کا سب سے بڑا کارخانہ ہے۔ اس وقت کارخانہ میں کام بند تھا۔

Marfat.com

کیونکہ اسمیں گنے کی فصل کے وقت صرف نومبر سے مئی تک کام ہوتا ہے ۔ یہ کارخانہ دسمبر ۱۹۵۰ء میں مکمل ہوا تھا فی الحال یہ تیس ہزار ٹن سالانہ چینی تیار کر رہا ہے ۔ جو پاکستان کی ضرورت کے پیش نظر نا کافی ہے ۔ توقع ہے کہ مزید مشینری لگ جانے کے بعد پیداوار دگنی ہو جائے گی ۔ کارخانہ میں ایک گھنٹہ میں ایک سو بوری چینی تیار ہوتی ہے اور ایک بوری میں پونے تین من چینی ہوتی ہے ۔ سیزن میں ۲۳ سو کے قریب مزدور کام کرتے ہیں ۔ ان میں سے مستقل ملازمین کو کام بند ہونے کی صورت میں الاؤنس دیا جاتا ہے ۔ مل کی طرف سے ۴۰۰ کارکنوں کیلئے کوارٹرز بنا دیے گئے ہیں جنمیں ضروری اشیا کی خرید و فروخت کیلئے کچھ کمیٹیں ہیں ۔ وقتاً فوقتاً مزدوروں کو فلم دکھانے کا انتظام کر دیا جاتا ہے ۔ اور ان کیلئے سپورٹس کی بھی سہولتیں مہیا کیگئی ہیں ۔ بچوں اور بالغوں کیلئے ماڈرن اسکول بھی مل کے خرچ سے بن رہے ہیں ۔ تمام مزدوروں کی لائف "انشورڈ" ہے ۔ جانی نقصان کی صورت میں مل کچھ معاوضہ بھی ادا کرتی ہے ۔ مل کے مینیجر صاحب نے بتایا کہ ہمارے اور مزدوروں کے تعلقات اتنے خوشگوار ہیں کہ کسی ٹریڈ یونین کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی شوگر مل کی عمارت کافی دیدہ زیب ہے ۔ کارکنانِ مل کی معیت میں ہم نے عمارت کے اندر نصب شدہ بڑی بڑی مشینوں کو بھی دیکھا جو اس وقت ساکت و جامد تھیں ۔ ہزاروں من کی لوہے اور دوسری دھاتوں کی کلیں دیکھیں جو سائنس کی قوت اور انسانی دماغ کی غیر معمولی صلاحیتوں کا مظہر تھیں ۔ اتنے بڑے اور وزنی آلات دیکھ کر آدمی حیران رہ جاتا ہے کہ انہیں نصب کیسے کیا ہوگا ؟

گنا بیلنے ، پاک صاف کرنے ، شیرہ بنانے اور پھر اسے دانوں کی شکل میں خشک کر دینے کی مشینیں بالترتیب دیکھیں ۔ جد ہم ایک وسیع گودام میں پہنچے ۔ جہاں نہایت سلیقہ سے بے شمار اور لاتعداد چینی کی بوریاں رکھی ہوئی تھیں جنہیں ایک نظر دیکھنے

Marfat.com

کے بعد یہ خیال ہو ہی نہیں سکتا کہ پاکستان میں چینی کی قلت ہے۔

چلتے وقت مینجر صاحب نے چینی کا ایک تھیلہ تحفہ کے طور پر ہمیں پیش کیا ایک میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہم مردان میں داخل ہو گئے۔ اچھا خاصا شہر ہے کھلے کھلے بازار، نئی نئی مارکیٹیں، خوبصورت ہوٹل اور دو سینما ہیں۔ ایک بازار میں ہماری کاریں ایک دم رُک گئیں۔ معلوم ہوا کہ چپلی کباب کھانے کا پروگرام ہے ہم اتر کر کباب والی دکان پر جا کھڑے ہوئے۔ پٹھان دکاندار بڑی پھرتی سے ایک بڑے "کڑھاؤ" میں کباب تل رہا تھا۔ انہیں چپلی کباب کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اور یہ بالکل چپل کی شکل کے ہوتے ہیں۔ ایک ایک کباب کا وزن یقیناً پاؤ، ڈیڑھ پاؤ سے کیا کم ہو گا۔ ان کبابوں کو گھی کی بجائے خالص چربی میں تلا جاتا ہے۔ چپلی کباب پٹھانوں کی مرغوب غذا ہے۔ انہیں ایک خاص قسم کی چٹپٹی چٹنی سے کھایا جاتا ہے جسکی وجہ سے یہ کافی لذیذ معلوم ہوتے ہیں۔ چپلی کباب سرحد کی ان چیزوں میں سے ہے جو اسکی انفرادیت کو برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ مردان کے بعد درگئی ہوتے ہوئے ہم دوپہر کے وقت جبن الیکٹرک پاور اسٹیشن پہنچے جہاں ایگزیکٹو انجینئر مسٹر ایوب پہلے سے ہمارے منتظر تھے۔ درگئی اور جبن کے یہ دونوں پاور اسٹیشن سرحد میں مردان، پشاور کوہاٹ اور ہزارہ اور پنجاب میں کیمبل پور اور راولپنڈی کیلئے بجلی سپلائی کر رہے ہیں۔ ایک اور نئی لائن قائم کی جا رہی ہے جس کے بعد پورے راولپنڈی کیلئے یہیں سے بجلی فراہم ہو سکے گی۔ جبن میں ½۲ سو فٹ کی بلندی سے ایک آبشار گرائی گئی ہے۔ اور پانچ جنریٹر نصب کئے گئے ہیں جو پانچ پانچ ہزار کلوواٹ بجلی پیدا کرتے ہیں۔ پہلے ہم نے جبن پاور اسٹیشن کے جنریٹر اور دوسری مشینری دیکھی۔ ہم دیکھ رہے تھے اور مسٹر ایوب ایگزیکٹو انجینئر ہمیں تفصیلات بتا رہے

Marfat.com

تھے۔ وہ بڑی برق رفتاری سے انگریزی بولتے ہیں معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی
جنریٹر اپنی پوری قوت سے کام کر رہا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے انکی زبان
کسی برقی قوت سے چل رہی ہے۔ برقی مشینوں کا معائنہ کرنے کے بعد ہم ایک
ٹریلر میں بیٹھ گئے جو پٹڑی پر کھڑی تھی۔ اور ہمیں اس کے ذریعے اوپر پہنچنا تھا
ڈھائی سو فٹ کی بالکل سیدھی چڑھائی تھی جب ہم سب بیٹھ گئے تو یہ گاڑی
لوہے کے ایک مضبوط تار کے ذریعے آہستہ آہستہ اوپر چڑھنے لگی جسے ایک مشین
کھینچتی ہے۔ درمیان میں پہنچے تو ایسا معلوم ہوا جیسے ہم فضا میں معلق ہو گئے
ہیں۔ مقامِ مقصود پر پہنچ کر گاڑی خود بخود رُک گئی۔ یہاں ہم نے پانی کو صاف
ہوتے اور مختلف سمتوں میں تقسیم ہوتے دیکھا تھوڑی دیر بعد ہم اسی گاڑی
میں بیٹھ کر نیچے آ گئے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ بھوک بڑے زوروں پر تھی۔ پیٹ
پوجا کیلئے ہم سوچ ہی رہے تھے کہ ایوب صاحب نے ہمیں کشمیر پوائنٹ
چلنے کو کہا کیونکہ وہیں کھانے کا انتظام کیا تھا۔ کشمیر پوائنٹ کے نام پر ہم چونکے
دریافت کیا کہ نام تو بڑا حسین ہے لیکن ہے کتنے فاصلے پر؟ جواب ملا چند قدم
پر ہے اور واقعی یہ جگہ غیر متوقع طور پر چند قدم پر ہی تھی۔ کیونکہ تھوڑی سی چڑھائی
کے بعد ہم وہاں پہنچ گئے۔

سایہ دار درختوں، سرسبز پودوں اور رنگا رنگ خوبصورت پھولوں
سے گھرا ہوا بڑا ہی پُر فضا مقام تھا۔ وہاں پہنچکر ایسا محسوس ہوا جیسے تھوڑی
دیر کیلئے ہم جہنم سے نکل کسی جنت میں داخل ہو گئے ہیں۔ خوشبو میں لبسا ہوا
ماحول عطر آمیز و سرور انگیز ہوا اور رومان پرور فضا — کیا کچھ نہ تھا وہاں!
اور اس پر مستزاد یہ کہ دائیں جانب آبشار کا حسین و جمیل منظر، صاف و شفاف
پانی جیسے روئی کے سفید گالے ہوں۔ موجیں تڑپ تڑپ کر اچھل رہی تھیں جیسے

Marfat.com

وہ بھی اس پُرکیف ماحول میں بے چین و بے قرار ہوگئی ہوں ۔ تھوڑی دیر کیلئے تو ہم اس روح نواز منظر اور کیف زا ماحول میں کھو گئے ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہم کسی نئی جگہ آ گئے ہیں ۔ آبشار کی وجہ سے یہاں اتنی ٹھنڈک تھی کہ سخت گرمی کی دوپہر میں بھی ہمیں سردی لگنے لگی ۔ ایسے موقع پر شعروشاعری کا دَور نہ چلتا تو بد مذاقی ہوتی چنانچہ مختصر سی شعرخوانی بھی ہوتی اور اس کے بعد میز پر کھانا چُن دیا گیا ۔ نمکین پلاؤ مرغی کا سالن اور بھنا ہوا مُرغ مسلّم ! ماحول کے اعتبار سے نہایت مناسب اور ذائقہ کے اعتبار سے بہت لذیذ تھا میزبانوں نے بڑی فیاضی سے کھانا تیار کیا تھا چنانچہ کھاتے وقت ہم نے بھی کسی تکلف یا بخل سے کام نہیں لیا ۔ شکم سیری کے بعد ہم نے روانگی فوراً ملتوی کردی اور طبیعت سیری کیلئے تھوڑی دیر یہیں وقت گذارنے کا فیصلہ کیا ۔ اسی عرصہ میں والئ صاحب سوات کا پیغام موصول ہوگیا ۔ جسمیں انہوں نے ہماری آمد پر خوشی کا اظہار کیا تھا ۔ اور سوات کی سیر کے سلسلے میں ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچانے کا یقین دلایا تھا ۔ چنانچہ شام کو ہم اپنے با اخلاق اور مخلص میزبانوں مسٹر ایوب ایگز یکٹو انجنیئر درگئی کا شکریہ ادا کرنے کے بعد رخصت ہوئے اور واپس پشاور روانہ ہونے کی بجائے سوات روانہ ہو گئے ۔ بے شمار موڑوں اور پیچدار سڑک سے گذرنے کے بعد جونہی ہم ریاست کی حدود میں پہنچے ، پولیس چوکی سے فوراً ہمارے داخلے کی اطلاع دے دی گئی ۔ ریاست کی سڑک پکی ہے جس پر ایک خاص قسم کی ریت اور کنکر ڈال دیے گئے ہیں راستہ میں بعض گاؤں پہاڑوں پر آباد ہیں ۔ ریاست میں داخل ہوتے ہی ہم نے موسم میں تبدیلی محسوس کی ۔ ہوا میں کافی خنکی تھی جلد ہی ہم ریاست سوات کے دارالخلافہ سیدو شریف میں پہنچ گئے ۔ یہاں مہمان خاص کی حیثیت

Marfat.com

سے ہمیں سوات ہوٹل میں ٹھہرایا گیا۔ یہ جدید طرز کا ہوٹل ایک مناسب جگہ ہے اور اسکی عمارت کافی دیدہ زیب ہے۔ رہنے کے کمرے بہت صاف ستھرے فرلشند اور عمدہ ہیں۔ دیگر آرام اور سہولتوں کے علاوہ اسکی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ ہر کمرہ میں نہانے کے دو نل تھے۔ بروقت ایک سے ٹھنڈا پانی نکلتا تھا اور ایک سے گرم۔ ہم سب پانچ ڈبل کمروں میں آ گئے۔ ان کمروں کا کرایہ مع خوراک ۵ر سو روپے روز سے ۱۲ر روپے روز تک ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ محل وقوع، خوبصورتی، صفائی۔ آرام اور خدمت اس ہوٹل کی وہ خصوصیات ہیں جن میں وہ دور تک اپنا جواب نہیں رکھتا۔

غروب آفتاب سے پہلے موجودہ والی کے والد محترم سابق والی سوات میاں گل شہزاد عبدالودود (بادشاہ صاحب) سے ملاقات کی۔ اس وقت آپکی عمر ۷۳ سال ہے۔ اردو بالکل نہیں سمجھتے اور پشتو اور فارسی کے علاوہ کوئی زبان نہیں جانتے۔ بادشاہ صاحب اگرچہ کافی ضعیف ہو چکے ہیں لیکن اب بھی اتنے توانا ہیں کہ ایک ہزار فٹ کی بلندی پر روزانہ چڑھتے ہیں۔ اور ان کا نشانہ کبھی خطا نہیں ہوتا۔ بادشاہ صاحب کی زندگی ریاست سوات کی مکمل تاریخ ہے کیونکہ آپ ہی نے اپنی بے پناہ مساعی سے اس کی بنیاد ڈالی اور ایک پسماندہ دور ماندہ علاقہ کو ترقی کی راہ پر گامزن کر دیا۔

ریاست سوات صوبہ سرحد میں شمال کی جانب واقع ہے۔ اگرچہ ابھی تک اس کے سروے کا کام پوری طرح تکمیل پذیر نہیں ہوا۔ تاہم ایک سرکاری اندازے کے مطابق اسکا طول ڈیڑھ سو میل اور عرض ۸۰ میل کے قریب ہے۔ سوات اپنی قدامت کے اعتبار سے ہندوستان کے قدیم ترین علاقوں میں شمار ہو سکتا ہے۔ ایک زمانہ میں یہ علاقہ بدھوں کا بڑا اہم مرکز تھا چنانچہ آج بھی بے شمار بدھوں کے استوپے

Marfat.com

خانقاہیں اور مندروں کے کھنڈرات اپنی تاریخی قدامت کی تصدیق کیلئے یہاں موجود ہیں۔ ۳۲۶ ق م میں سکندر اعظم نے ہندوستان کا رُخ کیا تھا تو سب سے پہلے اس نے سوات کو فتح کیا۔ اور اس پہاڑی علاقہ میں متعدد لڑائیاں لڑنے کے بعد اس کیلئے پیش قدمی کا راستہ صاف ہو گیا اور اُس نے ٹیکسلا کے مقام پر پہنچ کر پورس کو شکست دی۔ بیرونی ممالک کے سیاحوں کے بیانات کے مطابق اس وقت بھی سوات نہایت زرخیز اور خوبصورت علاقہ تھا۔ اور یہاں پوری طرح بُدھ ازم کا دور دورہ تھا۔ ہندوستان پر محمود غزنوی کے حملہ کے بعد لوگ پہلی مرتبہ سوات میں اسلام سے روشناس ہوئے اور بدھوں کا زور گھٹنا شروع ہوا لیکن اس عرصہ میں یہاں کوئی مستحکم حکومت قائم نہ ہو سکی ایک طویل عرصہ تک قبائلیوں کی سازشوں اور خانہ جنگیوں کا سلسلہ جاری رہا آخر وہ وقت آپہنچا جب ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان پر قبضہ کرنے کیلئے میدان میں آگئی اور مسلمانوں کے اندرونی خلفشار سے فائدہ اٹھانے کیلئے دوسری جانب سکھوں نے اپنا تغلب و تسلط قائم کرنے کیلئے اپنی مساعی تیز کر دیں لیکن اس وقت جبکہ سکھوں نے سوات کے وسیع علاقہ پر قبضہ کرنے کیلئے حملے شروع کئے۔ قدرت نے ایک عظیم شخصیت کو پیدا کیا جس نے اپنے غیر متزلزل عزم، خدا داد صلاحیتوں اور غیر معمولی شجاعت و ہمت کے بل پر کفر کی متحدہ قوتوں کا مقابلہ کیا اور ہر مقام پر باطل کے غرور کو توڑ کر رکھ دیا۔ اس عظیم شخصیت کو حضرت اخوند صاحب کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ کی تحریک اسی زمانہ میں اپنے نقطۂ عروج پر پہنچی ہوئی تھی۔ اخوند صاحب نے اس تحریک کی زبردست حمایت کی اور حضرت احمد شہید بریلوی کے ساتھ جہاد کا اعلان کر دیا۔ انہوں نے اپنے جانباز مجاہدین کے ساتھ سکھوں اور انگریزوں

Marfat.com

سے بے شمار جنگیں لڑیں اور مورچہ پر اپنی جنگی تیاریوں کی عدم موجودگی کے باوجود حملہ آوروں کی دانت کھٹے کردیئے جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ انگریز کو پھر کبھی اس طرف آنکھ اٹھانے کی جرأت نہیں ہوئی۔ آج وہ مجاہد اعظم ہم میں موجود نہیں لیکن اس کے تاریخی کارنامے اور عدیم المثال شجاعت کی داستانیں کبھی فراموش نہیں کی جا سکتیں۔ اخوند صاحب نے غلامئ افرنگ کی زنجیریں توڑنے، سوات میں اسلامی حکومت قائم کرنے اور پٹھانوں کو متحد و متفق کرنے کیلئے جو شاندار سیاسی و روحانی خدمات دی ہیں انہیں مستقبل کا مؤرخ کبھی نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اخوند صاحب کی وفات کے بعد پٹھان پھر منتشر ہو گئے اور وحشت و بربریت نے پھر پورے علاقہ پر اپنا تسلط قائم کر لیا۔ حکومتیں بنتی رہیں اور ٹوٹتی رہیں لیکن حالات میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوا۔ آخر ۱۹۱۷ء میں باشندگانِ سوات نے اخوند صاحب کے فرزند اور موجودہ والیٔ سوات کے والد میاں گل عبدالودود (بادشاہ صاحب) کو اپنا فرمانروا منتخب کر لیا۔ انہوں نے ازسرِنو فوج کو منظم کیا اور باغیوں کو پے درپے شکستیں دینے کے بعد اپنی حکومت کو جلد ہی مستحکم اور وسیع کر لیا۔ اس کے بعد انہوں نے پٹھانوں کو متحد کرنے اور انہیں سیاسی و مذہبی بیداری پیدا کرنے کیلئے جدوجہد کا آغاز کیا اور سوات کی تجارتی تعلیمی اقتصادی اور مالی ترقی کی طرف توجہ مبذول کی جس کے نتیجہ میں یہ پسماندہ علاقہ روز بروز ترقی کی منازل طے کرنے لگا۔ اور برٹش گورنمنٹ بادشاہ صاحب کو سوات کا آئینی بادشاہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئی۔ ایک طویل عرصہ تک آپ نے شاندار حکومت کی اور اپنے دور میں نئی نئی ترقیات اور اصلاحات سے ریاست کو مثالی بنا دیا۔ ۱۹۴۹ء میں ضعیفی کے باعث آپ نے اپنے فرزند میاں عبدالخالق جہاں زیب کو جانشین مقرر کر دیا جو تعلیم یافتہ ذہین اور

Marfat.com

روشن خیال انسان ہیں۔ انہوں نے چھ سال کے مختصر سے عرصہ میں اپنی بساط کے مطابق ریاست کو کافی سے زیادہ ترقی یافتہ بنایا، اور دیکھتے ہی دیکھتے اپنی چھوٹی سی اسٹیٹ کو پاکستان میں ایک نمایاں مقام پر پہنچا دیا۔

اس وقت سوات کی آبادی تقریباً ۵½ لاکھ افراد پر مشتمل ہے جنمیں سے ۸۰ فیصدی کا پیشہ زراعت ہے۔ چونکہ ندی نالوں، چشموں اور دریائے سوات کی وجہ سے پانی کی افراط ہے۔ اس لئے یہاں زرعی پیداوار بہت ہوتی ہے اور بہت کم زمین غیر کاشتہ ہے۔ پھل اور دوسری چیزیں بھی کثرت سے پیدا ہوتی ہیں۔ صنعت وحرفت کی طرف ابھی کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی۔ البتہ گھریلو صنعتوں کو کسی حد تک فروغ حاصل ہو رہا ہے۔ تجارت بھی آہستہ آہستہ ترقی کر رہی ہے۔ تعلیم پر حکومت سب سے زیادہ رقم صرف کر رہی ہے۔ اس وقت ایک انٹر کالج، دو عربی دارالعلوم، دو ہائی اسکول اور ۱۴ مڈل اور لوئر اسکول اور ۳۲ پرائمری اسکول ہیں۔ مزید تعلیمی ترقی جاری ہے۔ ریاست کی آمدنی ۶۵ لاکھ روپے سالانہ ہے جسے ترقیاتی منصوبوں پر کفایت شعاری سے خرچ کیا جاتا ہے۔ ریاستی فوج کی تعداد ۹۵ سو ہے اور پولیس کی نفری ۲ ہزار کے قریب ہے۔ آپ یہ جان کر حیران ہونگے کہ ریاست میں کوئی وکیل مقدمہ کی پیروی نہیں کر سکتا۔ فریقین اپنی وکالت خود کرتے ہیں۔ شرعی قوانین کے ساتھ مروجہ انگریزی قوانین بھی یہاں نافذ ہیں۔ مقتول کے وارث خوں بہا لیکر قاتل کی جان بخشی کر سکتے ہیں۔ بصورت دیگر وہ اپنے ہاتھ سے گولی بھی مار سکتے ہیں۔ ہاں سنگسار اور ہاتھ قلم نہیں کئے جاتے اور مقدمہ کے فیصلہ میں دو ہفتے سے زیادہ نہیں لگتے۔ پوری ریاست میں ایک شخص بھی غیر حنفی مسلمان نہیں ہے۔ البتہ ہندوؤں اور سکھوں کی ایک اچھی تعداد خوشحال زندگی بسر کر

Marfat.com

رہی ہے۔ ریاست میں کوئی سینما، چکلہ یا تفریح گاہ نہیں ہے۔ اور نشہ آور اشیا کے استعمال کی سخت ممانعت ہے۔ اگرچہ پشتو زبان بولی جاتی ہے لیکن جوں جوں تعلیمی شوق پیدا ہو رہا ہے اردو تیزی سے فروغ پا رہی ہے۔ یہ بات بڑی خوش آئند ہے کہ ریاست میں نئی اصلاحات کے نفاذ کا اعلان کر دیا گیا ہے جس سے یقیناً جمہوری اقدار کی نشو و نما ہوگی۔ اور عوام کو جدید تقاضوں کے مطابق قومی تعمیر و ترقی کا موقع ملے گا۔

یہ تھا ریاست سوات کی تاریخ، جغرافیائی اہمیت اور اسکی ترقیات کا اجمالی جائزہ۔ آئیے اب ہم آپ کو سوات کا آنکھوں دیکھا حال سنائیں۔ سیدو شریف میں ہم والئ صاحب سوات کے مہمانِ خاص تھے۔ انکی بیدار مغزی حسنِ اخلاق اور سادگی کے متعلق جو باتیں ہم نے سُنی تھیں۔ ان کے پیشِ نظر ہمیں ان سے ملنے کا کافی اشتیاق پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ ۲۱ جولائی کو صبح ۸ بجے ہم اُن سے ملنے کیلئے روانہ ہوئے۔ محل کے دروازے پر ان کے پرائیویٹ سیکرٹری نے نے ہمارا استقبال کیا اور ہمیں والئ صاحب کے کمرے کی طرف لے کر چلے۔ والی صاحب پہلے سے وہاں موجود تھے۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی انہوں نے کھڑے ہو کر ہمیں خوش آمدید کہا اور باری باری وفد کے تمام اراکین سے مصافحہ کیا۔ نام میاں گل عبدالخالق جہاں زیب، قامت متوسط، سُرخ و سپید چہرہ جس پر اب بڑھاپے کے آثار نمودار ہونے لگے ہیں۔ جنده رد گٹھا ہوا بدن اور سر کے بال اڑے ہوئے۔ بش شرٹ اور سادہ سی پینٹ میں ملبوس یہ انسان کسی طرح بھی ایک ریاست کا نواب معلوم نہیں ہوتا تھا۔ انہوں نے اپنے اندازِ تکلم و تخاطب سے کہیں بھی یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ ہم کسی ریاست کے روایتی والی سے بات کر رہے ہیں۔ وہ متعدد زبانیں بولتے ہیں۔ ہم نے اُن سے اُردو

Marfat.com

میں بات چیت کا آغاز کیا۔ اور انہوں نے بھی اردو ہی میں سلسلۂ کلام جاری رکھا پاکستان کے کئی مسائل پر تبادلۂ خیال کرنے کے بعد ہم نے سوالات شروع کر دیئے ہمارا خیال تھا کہ وہ بعض چبھتے ہوئے سوالوں کا جواب "گول مول" دیں گے لیکن ہم حیران ہوئے جب انہوں نے صاف صاف تمام حالات بتا دیئے وہ باخبر رہتے ہیں۔ اور ریاست کے ہر شعبہ کے متعلق انہیں معلومات حاصل رہتی ہیں۔ حافظہ اچھا ہے اور مطالعہ کے شوقین ہیں۔ انہیں ان اخباروں کے نام بھی یاد تھے جو بہاولپور سے ان کے نام جاتے ہیں۔ والی صاحب نے کئی سوالوں کا جواب دیتے ہوئے بتایا کہ ریاست میں کوئی سیاسی تنظیم نہیں کیونکہ جرگہ سسٹم کی موجودگی میں یہاں اسکی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی۔ جماعت اسلامی کے تیس چالیس آدمی ضرور موجود ہیں۔ لیکن انکی جماعتی حیثیت نہیں۔ نہ ہی انہیں اپنے مقاصد کی اشاعت کی ضرورت ہے۔ یہاں سے کوئی اخبار شائع نہیں ہوتا لیکن حکومت کی طرف سے ایسی کوئی پابندی نہیں ہے۔ انہوں نے تسلیم کیا یہاں قیدیوں سے بیگار لیجاتی ہے اور سڑکوں وغیرہ کی تعمیر میں مزدوروں کی جگہ قیدی بھی کام کرتے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ ریاست میں تعلیم مفت ہے غلہ فاضل پیدا ہوتا ہے جسے باہر برآمد کیا جاتا ہے۔ معدنیات کی دریافت کے سلسلہ میں پاکستان کے کچھ ماہرین پچھلے دنوں آئے تھے لیکن کوئی خاص کامیابی حاصل نہیں ہوئی انہوں نے کہا کہ وہ روزانہ عدالت میں بیٹھتے ہیں اور ہر شخص آسانی سے انہیں مل سکتا ہے ہماری یہ ملاقات ایک گھنٹہ تک جاری رہی۔ آخر میں انہوں نے ہماری آمد کا شکریہ ادا کیا اور محل کے گراؤنڈ میں پہنچ کر ہمارے ساتھ ایک گروپ فوٹو کھچوایا چلتے وقت انہوں نے دریافت کیا "آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں۔ وداع ہونے کے بعد ہم سیدو شریف سے ۹ بجے اپنی کاروں پر ریاست کی سیر کیلئے روانہ ہو گئے

Marfat.com

سیدو شریف میں جہاں زیب کالج، جامع مسجد، ہسپتال اور دوسری خولصورت عمارتوں کے علاوہ شاہی محل بھی قابل دید ہیں۔ سیدو شریف سے ایک میل کے فاصلہ پر منگورہ ہے جسے ۱۹۴۳ء میں بنایا گیا تھا۔ نئے طرز کا بازار، وسیع سڑکیں بڑی بڑی دکانیں اور خولبصورت پکی عمارات ہیں۔ زری کی ٹوپیاں شہد اور گھی یہاں کی مشہور چیزیں ہیں، منگورہ دیکھنے کے بعد پہاڑوں کا ایک خاصا طویل سلسلہ طے کرتے ہوئے مدین کی طرف روانہ ہوئے۔ راستہ میں تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر چھوٹے چھوٹے گاؤں آتے ہیں جنہیں اکثر و بیشتر گھر کچے اور یک منزلہ ہیں۔ ان میں کمرے چھوٹے اور ایک حد تک زمین دوز ہوتے ہیں۔ اکثر و بیشتر گاؤں پہاڑوں کی آغوش میں ہیں۔ مکانات پہاڑوں کی بلندی کے ساتھ ساتھ بتدریج اونچے ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اور دُور سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے زینہ ہو جس طرف سے بھی ہم گذرے سرسبزی و شادابی نے ہمارا خیر مقدم کیا۔ ہم نے بہت کم بنجر زمین دیکھی حتیٰ کہ پہاڑ بھی سرسبز تھے اور اُن پر بھی کاشت کیگئی تھی۔ جگہ جگہ دریائے سوات، چشمے اور نہریں ملتی ہیں جنکی وجہ سے مناظر کی دلکشی میں کافی اضافہ ہوگیا ہے۔ بحرین کی طرف جاتے ہوئے سامنے پہاڑوں کی چند بلند چوٹیاں نظر آتی ہیں جن پر جمی ہوئی نقرئی برف آفتاب کی روشنی میں اپنی جھلملاہٹ اور چمک سے آنکھیں خیرہ کر دیتی ہے۔ یہ برف پوش پہاڑ چترال کے قریب واقع ہیں۔ پوری ریاست میں ایک ہی نقشہ کے بہت سے قلعے بنے ہوئے ہیں جو تحصیلدار اور پولیس کے دفاتر کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ کالے کپڑوں میں ملبوس سواتی عورتیں بھی راستہ میں آتی جاتی دکھائی دیتی ہیں جو کسی مرد کو آتا دیکھ کر فوراً اپنی چادر سے منہ ڈھانپنے کی کوشش کرتی ہیں سیاہ کپڑوں میں ان کا گورا چٹا جسم اور زیادہ جاذب نظر معلوم ہوتا ہے۔ سوات کے مرد و زن صحت مند، جسیم اور حسین نقش و نگار

Marfat.com

کے حامل ہوتے ہیں. اور نہایت جفاکش اور محنتی ہیں اور روزی پیدا کرنے کیلئے لکڑی اور گھاس کے گٹھر دور دور سے اٹھا کر لاتے ہیں۔ سواری کیلئے زیادہ تر خچر اور گدھے استعمال کئے جاتے ہیں۔ ان پر دیگر سامان کے علاوہ سواتی پہاڑوں پر سے برف بھی لاد کر لاتے ہیں اور شہروں میں فروخت کر دیتے ہیں۔ سوات میں اگرچہ چکلوں کا کہیں وجود نہیں لیکن عزت و افلاس کی وجہ سے "پرائیویٹ ذرائع" موجود ہیں۔ عوام میں تعلیمی شوق کافی ہے، اسکولوں کی کمی کی وجہ سے طلباء دور دور سے پڑھنے آتے ہیں۔ ہم یہ دیکھکر کافی متاثر ہوئے کہ جس طرف سے گذرے۔ اکثر اشخاص بالخصوص بچوں نے ہمیں سلام کیا۔ راستہ کے مختلف نشیب و فراز طے کرتے ہوئے کرا کر کنڈاؤ پر پہنچکر تھوڑی دیر کیلئے رک گئے۔ یہ مقام سطح سمندر سے ۳۸۰۰ فٹ بلند ہے یہاں وادیٔ زیریں اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے اور حد نظر تک سبزہ ہی سبزہ اور ندیوں سے عجیب نظر فریب سین پیدا ہوتا ہے۔ کافی نشیب میں پہنچکر شہر مدین دیکھا، درمیانہ درجہ کی آبادی ہے۔ بازار وسیع ضرور ہیں لیکن خوبصورت نہیں۔ یہاں کی آب و ہوا اور فضا خوشگوار ہوتی ہے۔ مدین کے بعد ہم بحرین پہنچے۔ یہاں اچھی سڑک ختم ہو جاتی ہے۔ اس سے آگے آسریت ہے جہاں صرف جیپ جا سکتی ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ علاقہ بہت ہی زیادہ نظر نواز اور دلکش ہے بحرین بھی بہت پرفضا مقام ہے نام سے ظاہر ہے یہاں دو سمتوں بھاری بھاری پتھروں میں سے گذرتا ہوا آتا ہے اور دوسری طرف سے ایک چشمہ یہاں آکر گرتا ہے۔ اس اتصال سے ایک عجیب منظر پیدا ہو جاتا ہے۔ موجوں کے ٹکراؤ سے پانی سفید سفید روئی کے گالوں کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور لہروں کی مترنم صداؤں پر دل رقص کرنے لگتا ہے، پانی کی وجہ سے ہوا بھی خنک ہوتی ہے۔ اس جگہ لکڑی کا پل بھی بنا ہوا ہے۔ آنے جانے والے مسافر اس پل پر ٹھہر جاتے ہیں اور تھوڑی دیر بعد

Marfat.com

انکی ساری تھکن دور ہو جاتی ہے ۔یہاں ہم نے ۸ ؍ آنے سیر کے حساب سے سیب خرید کر کھائے اور قریب ہی ایک ہوٹل میں چائے پی ۔اس وقت آسمان پر گھنگھور گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں ۔ہم نے چائے کی پیالوں کو منہ سے لگایا ہی تھا کہ چھما چھم مینہ برسنے لگا ۔اور موسم اتنا خنک ہو گیا کہ ہمیں دوپہر کے وقت سردی محسوس ہونے لگی ۔بحرین سوات میں سب سے اچھا ہل سٹیشن ہے اور یہاں لوگوں کی ایک بڑی تعداد آباد ہے ۔انکی اکثریت غربت و افلاس کی شکار ہے اور تعلیم و تربیت کے لحاظ سے بہت پسماندہ ! ہم نے دیکھا کہ لوگ جوتوں کی بجائے پاؤں میں چمڑے یا گھاس باندھے ہوئے تھے ۔ ہاتھوں میں کدال یا پھاوڑا بدن پر تار تار کپڑے ایک ایک قمیض میں بلامبالغہ پچاس پچاس پیوند ! لیکن اس کے باوجود وہ مدقوق اور افسردہ نہیں تھے ۔ بلکہ اپنی اسی زندگی میں خوش نظر آتے تھے ۔ایک گھنٹہ تک لطف اٹھانے کے بعد بارش ہی میں واپس ہوئے ۔راستے میں کہیں بادلوں کے جھرمٹ تھے اور کہیں مطلع بالکل صاف تھا ۔کہیں صاف بارش تھی اور کہیں اسکا نام و نشان بھی نہ تھا ۔ بستی "پیر بابا" میں بھی ہم تھوڑی دیر کیلئے رکے ۔اور سید علی ترمذی عرف پیر بابا اور پائندہ شاہ عرف چمڑے بابا کے مزارات پر فاتحہ پڑھی ۔پیر بابا ایران سے آئے اور اپنے مرشد کی ہدایت پر بنیر (ریاست سوات) میں آباد ہو گئے تھے ۔ یہاں ان کے ہزاروں مرید ہیں ۔لوگ انکا نام لیکر راستہ چلتے ہیں ۔ مقبرے میں چاروں طرف آئینے آویزاں ہیں اور طرح طرح کے جھنڈے لگے ہوئے ہیں جنہیں عقیدتمند منت کے طور پر چڑھاتے ہیں ۔مزار پر ہر وقت فقیروں کی بہتات رہتی ہے اس کے ساتھ ہی ایک شاندار مسجد حال ہی میں تعمیر کیگئی ہے ۔ ریاست سوات کی سرحد کے خاتمہ پر زبردست جھکڑ اور آندھی نے ہمیں آگے بڑھنے سے روک دیا اور گرم کپڑوں کی ضرورت کا شدید احساس دلایا ۔ہم تھوڑی دیر کیلئے سرکاری ریسٹ

Marfat.com

ہاؤس میں ٹھہر گئے اور گرم گرم چائے سے خنکی کی شدت کا مقابلہ کرنے لگے وہاں سے روانہ ہو کر شام کو ہم واپس ہیڈ کوارٹر پشاور پہنچ گئے۔ آج ہم نے ۲۵۰ میل سفر کیا۔ چونکہ سارے دن مسلسل سفر سے بہت تھک گئے تھے۔ اسلئے کھانا کھا کر فوراً سو گئے۔

ایبٹ آباد اور بالاکوٹ:

۲۲ جولائی کی صبح کو جب آفتاب عالمتاب مشرق سے نمودار ہوا تو ہم اپنا رخت سفر باندھ چکے تھے۔ پشاور میں یہ ہمارا آخری دن تھا کیونکہ ہم سرحد کے تقریباً تمام اہم شہر اور مقامات دیکھ چکے تھے۔ اور اب ہمیں وادئ کاغان جانا تھا علی الصبح ناشتہ کرنے کیبعد ہم نے سروس ہوٹل میں مسٹر رشید ڈپٹی ڈائریکٹر انفرمیشن اور مسٹر حبیب ٹورسٹ آفیسر کو الوداع کیا۔ ان دونوں حضرات نے اس دورہ میں جس اشتراک و تعاون اور خلوص و محبت کا ثبوت دیا۔ اسکی یادوں کے نقوش صفحۂ دل سے کبھی نہ مٹ سکیں گے۔ حقیقت میں وہ ہم سے اتنے گھل مل گئے تھے کہ جب ہم اُن سے جدا ہوئے تو ایسا محسوس ہوا جیسے ہمیں کوئی دو عزیز داغِ مفارقت دے رہے ہوں۔

کاریں آگئیں اور ہم نے شاپنگ کرنے کی غرض سے پہلے شہر کا رُخ کیا پہاڑوں پر چڑھنے کیلئے پشاوری چپلیں خریدی گئیں۔ جن لوگوں کے پاس برساتیاں نہیں تھیں۔ انہوں نے بارش سے بچنے کیلئے برساتیاں لیں۔ دوسری متفرق چیزیں خریدنے اور مختلف بازاروں میں گھومنے کے بعد ۱۱ بجے کے قریب ہم ایبٹ آباد کیلئے روانہ ہو گئے۔ راستہ میں خیر آباد بھی دیکھا جہاں دریائے اٹک اور دریائے کابل ملتے ہیں۔ تھوڑی دُور تک دونوں دریاؤں کا پانی ساتھ ساتھ لیکن علیحدہ علیحدہ بہتا نظر آتا ہے۔ اور اسطرح دو رنگے پانی کا نظارہ قابل

Marfat.com

دید ہوتا ہے۔ یہیں سلطنت مغلیہ کے زمانہ کا ایک عظیم الشان قلعہ ہے جس میں اب فوج رہتی ہے۔ یہ قلعہ ـ قلعۂ اٹک کے نام سے مشہور ہے، سالہا سال گذرنے کے باوجود اسکی دیواریں اب بھی بے انتہا مضبوط ہیں۔ اسکے چاروں طرف حصار کی دیواریں اتنی چوڑی ہیں کہ باآسانی گھوڑے دوڑ سکتے ہیں۔

قلعہ کے قریب ہی کچھ ویران کھنڈرات بھی ہیں خیر آباد سے آگے ہم حسن ابدال رُکے اور گورونانک کا پنجہ دیکھنے گئے لیکن مندر کے دروازے پر تالا پڑا ہوا تھا۔ اور اُسے کھلوانے کیلئے اجازت حاصل کرنے کی ضرورت تھی لیکن چونکہ ہمارے پاس اتنا وقت نہیں تھا اسلئے ہم یہ مشہور پنجہ نہیں دیکھ سکے۔

کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ گورونانک اپنے چیلوں کے ہمراہ یہاں پہنچے۔ اسی زمانہ میں نزدیک ہی ایک پہاڑی پر پیر قندھاری رہا کرتے تھے۔ گورونانک نے اپنے ایک چیلے کو ان کے پاس پانی لینے کیلئے بھیجا۔ لیکن انہوں نے انکار کردیا اور ایک پتھر نیچے لڑھکا کر کہا کہ اگر وہ فقیر ہے تو اسمیں سے پانی پیدا کرلے گا۔ گورو نے اس بھاری پتھر کو اپنے پنجہ سے روک لیا۔ یہ پتھر اب تک محفوظ ہے جس پر پنجہ کا نشان ہے۔ اور اسمیں سے اب بھی پانی نکلتا ہے۔ واللہ اعلم بالصّواب

مرراہے ہری پور بھی دیکھا۔ بڑی سرسبز وشاداب جگہ ہے۔ یہاں بیشمار باغات ہیں۔ زیادہ تر فروٹ یہیں سے برآمد کیا جاتا ہے۔ ہری پور سے آگے کچھ پہاڑ آتے ہیں جنکے پتھروں سے سیمنٹ تیار ہوتی ہے۔ قریب ہی واہ ـ فیکٹری ہے۔ ۲ بجے کے قریب ہم ایبٹ آباد پہنچ گئے۔ ڈائریکٹر ٹورسٹ بورڈ مسٹر صحرائی اور مقامی صحافیوں نے ہمارا خیر مقدم کیا جنمیں خان فقیر احان ایڈیٹر انکشاف کے علاوہ ایڈیٹر جمہور، ایڈیٹر لقیب شامل تھے۔ دوپہر کا لنچ انہی لوگوں کے ساتھ کھایا۔ خان فقیر احان جتنی دیر ہمارے ساتھ رہے انکی عجیب و غریب شخصیت

Marfat.com

ہی توجہ کا مرکز بنی رہی۔ بھاری بھرکم جسم، لمبا قد، چٹا رنگ، چہرے سے داڑھی مونچھ اس طرح غائب تھیں جیسے کبھی بال اُگے ہی نہیں۔ سرحد اسمبلی کی ممبری، لیڈری اور ایڈیٹری سبھی کچھ کرتے ہیں۔ ان کی خوفناک صاف گوئی سے دوست بھی پناہ مانگتے ہیں۔ اور دشمن بھی سرحد میں ادنیٰ سے اعلیٰ تک سبھی سے تعلقات ہیں۔ اور چپڑاسی سے لیکر وزیر اعلیٰ تک سب سے بے تکلفانہ ملتے ہیں خان کی باتیں بہت دلچسپ ہوتی ہیں۔ کہنے لگے انگریزوں کو واپس بلانے کیلئے میں نے ایک تحریک شروع کی ہے۔ اور انجمن بنائی ہے۔ آپ بھی اس کے ممبر بنیں۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے اخبار انکشاف کا تعارف بھی کرایا جو اسم بامسمیٰ ہے۔

انہوں نے بتایا انکشاف کسی سے نہیں ڈرتا۔ اس کا کوئی چندہ نہیں اور نہ یہ اشتہار قبول کرتا ہے۔ بڑے سے بڑے افسر یا عزیز سے عزیز دوست کا بھی کچا چٹھا شائع کرنے میں اسے باک نہیں۔ خان ہرفن مولا ہے جسے اچھے بُرے کمانے کے سارے گُر آتے ہیں۔ اسکا قلم اور زبان ایسی ننگی تلواریں ہیں جن سے کوئی محفوظ نہیں رہ سکتا۔ لنچ کے بعد خان کی دلچسپ ملاقات ختم ہوگئی۔ ایبٹ آباد میں ہم نے صرف دو گھنٹہ آرام کیا اور ½ ۵ بجے بالاکوٹ روانہ ہوگئے۔ کیونکہ رات کو ہمارے قیام کا انتظام وہیں کیا گیا تھا۔ ایبٹ آباد سے ایک سرکاری گائیڈ ہمارے ہمراہ کردیئے گئے۔ ۱۵ میل کے فاصلہ پر مانسہرہ آیا جس کی آبادی تقریباً ۸ ہزار ہے راستہ میں اتنی بڑی بڑی چڑھائیاں ہیں کہ موٹر یا کار کا انجن بھی پناہ مانگنے اور چیخنے لگتا ہے۔ اس کے علاوہ اتنے خطرناک موڑ ہیں کہ ڈرائیور کے ہاتھ پھرکی بنے رہتے ہیں اور اُسے خود آنکھ جھپکنے کی مہلت نہیں ملتی۔ پہلے معلوم ہوتا ہے کہ سامنے کا پہاڑ کافی بلند ہے لیکن جب اسے عبور کرکے کافی بلندی پر پہنچ جاتے ہیں تو وہی عبور شدہ پہاڑ ایک ٹیلہ دکھائی دیتا ہے۔ سڑک کے دونوں جانب

Marfat.com

دائیں بائیں چیڑ کے حسین درختوں کا ایک لامتناہی سلسلہ نظر آتا ہے ان کے ساتھ چنار کے لمبے لمبے درخت بھی اکثر ملتے ہیں. شام ہوتی جا رہی تھی اور اونچے نیچے مقامات اور پیچ در پیچ موڑ ختم ہونے کا نام نہیں لیتے تھے. نتیجہ یہ ہوا کہ پٹرول کی بدبو اور پیہم چکروں کی وجہ سے طبیعتوں میں امتلا پیدا ہو گیا. آخر خدا خدا کر کے یہ خشک سفر ختم ہوا. اور ہم غروب آفتاب کے وقت بالاکوٹ پہنچ گئے جہاں ڈاک بنگلہ میں، ہمارے قیام و طعام کا پہلے ہی سے انتظام کر دیا گیا تھا.

بالاکوٹ بڑا اہم تاریخی مقام ہے جہاں آج سے تقریباً ڈیڑھ سو سال پہلے ہندوستان کی ایک عظیم اسلامی تحریک اپنے نقطۂ عروج پہنچی اور آخر یہاں ختم ہو گئی اس عظیم تحریک کے ان دو عظیم المرتبت رہنماؤں حضرت اسماعیل شہیدؒ اور سید احمد شہید کے مزارات آج بھی یہاں موجود ہیں. جنہوں نے ہندوستان میں مسلمانوں کی عظمت و شوکت کے تحفظ کیلئے کفر کی طاقتوں سے معرکتہ الآرا جہاد کیا. اور اسلامیانِ ہند کو بیدار کر کے انہیں وہ نصب العین دیا جسے آہستہ آہستہ فراموش کیا جا رہا تھا. حقیقت یہ ہے کہ اگر یہ لوگ اپنے خون سے ہند کے چمنِ اسلام کی آبیاری نہ کرتے تو خزاں کے ہاتھوں پامال ہونے کا اسے شدید خطرہ لاحق ہو گیا تھا لیکن خدا کا شکر ہے کہ وہ خطرہ ٹل گیا. اور آج ہمارا یہ چمن بہار ساماں ہے اور اس کے باغبانوں کے خون کی سرخیاں گل و لالہ کی شکل میں نمایاں ہو رہی ہیں.

بالاکوٹ اپنی شہرت، آبادی یا محلِ وقوع کے اعتبار سے کوئی قابلِ ذکر مقام نہیں اسکی اہمیت و عظمت محض ان دو شخصیتوں کی رہینِ منت ہے جنہیں حضرت محمد اسماعیل شہید اور سید احمد شہیدؒ کے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے صوبہ سرحد میں شاہ ولی اللہ کی اسلامی تحریک کی باگ ڈور جب اُن کے صاحبزادے شاہ عبدالعزیز دہلوی کو سونپ دی گئی اور انہیں جماعت کا امام تسلیم کر لیا گیا.

Marfat.com

تو انہوں نے تحریک کو از سر نو منظم کیا اور اس کے مختلف شعبے قائم کئے عسکری شعبہ کیلئے شاہ کی نگاہ انتخاب سید احمد شہید پر پڑی اور انہیں ریاست ٹونک کی فوج میں حصولِ تربیت کیلئے بھیجدیا۔ وہاں سے واپسی کے بعد انہیں اور اسمٰعیل شہید کو ایک مشن پر صوبہ سرحد پر روانہ کردیا۔ جہاں انہوں نے وادیٔ کاغان وادیٔ سوات اور پشاور کے قرب وجوار میں اپنے تنظیمی، اصلاحی اور تبلیغی کاموں کا آغاز کیا۔ ان کی انتھک مساعی کا نتیجہ یہ نکلا کہ پٹھانوں نے چند ہی دنوں میں اسلامی تحریک کو اپنا لیا اور جوق در جوق انکے حلقۂ اثر میں آگئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک بڑی فوج تیار ہوگئی جس نے سید احمد شہیدؒ اور محمد اسمٰعیل شہیدؒ کی قیادت میں فتوحات کرنے کے بعد حکومت الٰہیہ بھی قائم کردی۔ افغان حکمرانوں نے جب یہ حال دیکھا تو وہ بہت برافروختہ ہوئے اور انہوں نے پورے علاقہ میں نفاق انگیزیوں، ریشہ دوانیوں اور سازشوں کا جال بچھادیا۔ بگڑے ہوئے حالات کے پیش نظر سید احمد اور اسمٰعیل شہید نے فیصلہ کیا کہ کچھ عرصہ کیلئے یہ علاقہ چھوڑ دیا جائے انہوں نے جب یہ فیصلہ اپنے عقیدتمندوں اور مریدوں کو سنایا تو انہوں نے انہیں تنہا جانے نہ دیا اور لوگوں کی ایک خاصی بڑی تعداد ان کے ساتھ کشمیر جانے کیلئے روانہ ہوگئی۔ بالاکوٹ کے مقام پر اس قافلہ نے قیام کیا۔ اس وقت غالباً شیر سنگھ کی لاتعداد فوج بھی کہیں قریب ہی پڑاؤ ڈالے پڑی تھی۔ اسے جب اس قافلہ کے قیام کا پتہ چلا تو اس نے سکھوں کی گذشتہ ناکامیوں اور شکستوں کا انتقام لینے کیلئے اپنی فوج کو بالاکوٹ کی طرف کوچ کا حکم دیا۔ چاروں طرف پہاڑیوں کی وجہ سے بالاکوٹ ایک مضبوط قدرتی قلعہ کی حیثیت رکھتا تھا جہاں سکھ فوج کی کچھ پیش نہ چل سکتی تھی۔ لیکن خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ سکھوں کو ننگ اسلام اور غدار قوم مسلمان کی

Marfat.com

اعانت حاصل ہوگئی جس نے ایک خفیہ راستہ سے سکھ فوج کو بالاکوٹ پہنچا دیا۔ مجاہدین کو غنیم کی فوج کی آمد کا علم ہوا تو وہ بھی اپنے دفاع کیلئے کمربستہ ہوگئے جنگ شروع ہوگئی۔ مجاہدین بڑی بے جگری سے لڑے اور بے شمار سکھوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا چونکہ سکھ ایک غدار کی وجہ سے پہاڑیوں پر قبضہ کر چکے تھے۔ اور مجاہدین کھلے میدان میں تھے اس لئے مقابلہ بہت دشوار ہوگیا مجاہدین کی ایک بڑی تعداد جب شہید ہوگئی تو سید احمد اور سید محمد اسمٰعیل غضبناک ہوکر تلواریں لہراتے ہوئے دشمن کی صفوں میں گھس گئے۔ اور ان گنت آدمیوں کو ہلاک کرنے کے بعد آخر خود بھی جام شہادت نوش کر لیا۔ سید احمد شہید کا سر قلم کر کے لاہور لایا گیا اور دھڑ بالاکوٹ میں دفن کر دیا گیا۔ شاہ محمد اسمٰعیل شہید بھی خفیہ طور پر یہیں مدفون کئے گئے۔ یہ مقدس ہستیاں آج ہم میں موجود نہیں لیکن ان کی شہادت کا یہ عظیم واقعہ آج بھی ہندوستان کی اسلامی تاریخ کا جلی عنوان ہے۔

بالاکوٹ میں جب ہم پہنچے تو سفر کی وجہ سے کافی تھکے ہوئے لیکن ان شہیدوں سے ہماری عقیدت نے بیٹھنے نہ دیا اور ہم آرام کئے بغیر ان کے مزارات کی زیارت کیلئے چل کھڑے ہوئے۔ سب سے پہلے سید احمد شہید کے مزار پر پہنچے۔ یہ مزار پختہ بنا ہوا ہے۔ یہاں فاتحہ پڑھنے کے بعد ہم نے شاہ اسمٰعیلؒ جنہیں بالاکوٹ کے باشندے شہید بابا کہتے ہیں کا مزار دریافت کیا جو کچھ بلندی پر واقع ہے۔ راستہ خطرناک ہونے کے باعث ہمیں رات کے وقت وہاں جانے سے روک دیا گیا۔

بالاکوٹ ایک چھوٹا سا گاؤں ہے جس میں چند دکانوں پر مشتمل معمولی قسم کا ایک بازار ہے۔ مکانات کچے ہیں اور لوگ بہت غریب ہیں۔ بازار اور رہائشی گھروں کے درمیان ایک ندی بڑی تیزی سے بہتی ہے جس پر ایک پل بھی

Marfat.com

بنا ہوا ہے۔ یہ بڑا عمدہ تفریحی مقام ہے۔ اگر یہاں لوگوں کے بیٹھنے اور سیر کرنے کیلئے پارک کی قسم کی کوئی جگہ بنادی جائے تو ایک بہت بڑی ضرورت پوری ہو جائے گی اور سیاحوں کو بھی ایک دلکش جگہ سے محظوظ ہونے کا موقع مل جائے گا۔

بالاکوٹ کا پانی بہت ٹھنڈا ہوتا ہے اور ہوا بھی کافی خنک ہوتی ہے جس سے موسم عموماً خوشگوار رہتا ہے۔ کھانا کھانے کیبعد رات کو ہم نے یہیں آرام کیا

وادی کاغان :

رات کو بالاکوٹ میں آرام کرنے کیبعد ۲۳ ؍ جولائی کو صبح ہمیں کوچ کا حکم دے دیا گیا یہاں ہمیں اپنی کاروں کو خیرباد کہنا پڑا کیونکہ یہاں سے آگے کاروں کی نزاکت سنگلاخ راستہ کی مستحق نہیں ہو سکتی تھی چنانچہ تین سرکاری جیپیں آگئیں اور ہم چھ بجے بالاکوٹ سے روانہ ہو گئے۔ وادی کاغان بالاکوٹ سے ہی شروع ہو جاتی ہے اور یہیں سے موسم میں کسی حد تک تبدیلی ہو جاتی ہے۔ صبح خاصی خنکی تھی اسلئے ہم نے اپنے اس سفر میں پہلی مرتبہ سویٹر کی ضرورت محسوس کی۔ بعض ساتھیوں نے برساتیاں اوڑھ لیں۔ تھوڑی ہی دور گئے ہوں گے کہ ہمیں راستہ کی خطرناکی کا احساس ہوا۔ کیونکہ سڑک بہت چھوٹی ہے اور پہاڑ کی آغوش میں ہونے کے باعث گیسوئے پُرخم بن گئی ہے۔ بیشمار موڑ ہیں اور راستے خطرناک ہیں کہ خدا یاد آتا ہے۔ اس سڑک پر دو جیپیں برابر برابر نہیں چل سکتیں۔ بلکہ بعض جگہ تو ایک جیپ کیلئے بھی اس کا دہن تنگ معلوم ہوتا ہے۔ یہاں ڈرائیو کرنے کیلئے ایک بہت ہی مشاق اور تجربہ کار ڈرائیور کی ضرورت ہوتی ہے جو ایک پل کیلئے اپنی توجہ کسی دوسری جانب مبذول نہیں کر سکتا اس کے پاؤں سے بریک دبانے اور اس کے ہاتھوں سے اسٹیرنگ گھمانے میں اگر ذرا بھی لغزش ہو جائے تو جیپ ہزاروں فٹ نیچے آ رہے اور پتہ بھی نہ چلے

Marfat.com

کہ کہاں گئی۔ سڑک کے ساتھ ساتھ نیچے دریائے کنہار بہتا ہے جو دریائے جہلم میں جا گرتا ہے۔ یہ دریا کہیں انتہائی تیزی سے بہتا ہے اور کہیں بہت آہستہ حقیقت یہ ہے کہ یہی دریا اس وادی کی جان کہلا سکتا ہے۔ اسکی وجہ سے سرسبزی وشادابی میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے اور مزید ہو سکتا ہے۔ یہی نہیں کہ اس دریا نے تمام علاقہ زرخیز بنا کر اسکی آب و تاب کئی گنا بڑھا دی ہے بلکہ اس وادی میں لاتعداد دلکش مناظر جنم دیے ہیں صبح سویرے جب آفتاب کی ضیا بار کرنیں پھوٹتی ہیں تو کنہار کی اٹھتی ہوئی بیقرار موجیں انہیں اپنی آغوش میں جذب کر لیتی ھیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے دریا نے نورانی لباس پہن لیا ہو غروب آفتاب کے وقت بھی دریا کا نظارہ قابلِ دید ہوتا ہے۔ جب شفق کی سرخی پانی میں گھل مل جاتی ہے اور اٹھلاتی بل کھاتی ہوئی لہریں سنہری جوڑے زیب تن کر کے رقصاں نظر آتی ہیں۔ دوپہر کے وقت کہیں پانی نیلگوں ہوتا ہے اور کہیں سفید براق جیسے سیال چاندی بہہ رہی ہے۔

مختلف بستیاں آئیں اور گزر گئیں مگر ان نظر نواز نظاروں میں ایسے محو ہوئے کہ کچھ پتہ ہی نہ چلا یہاں تک کہ تھوڑی دیر کیلئے راہ کے دشوار گذار نشیب و فراز سے بھی بے نیاز ہو گئے۔

بالا کوٹ ۲۵½ میل فاصلہ طے کرنے کیبعد مہندری کے مقام پر ہماری جیپیں رک گئیں چونکہ اس سڑک پر (One way) ٹریفک ہے اسلئے ۹½ بجے سے پہلے آگے کوئی جیپ نہیں جا سکتی۔ تاکہ اس وقت تک دوسری طرف سے بھی ٹریفک آ جائے۔ اس وقفہ میں ہم نے چائے نوشی کی۔ اس کے بعد کچھ لوگ تو رمی اڑانے لگے۔ اور کچھ دریا کے کنارے گپ شپ میں مشغول ہو گئے۔ منہ ہاتھ دھونے کی غرض سے جب ہم نے پانی میں پہلی بار ہاتھ ڈالا تو ایک

Marfat.com

دم چونک پڑے۔ برف کی طرح یخ پانی تھا جس میں ایک منٹ سے زیادہ دیر تک ہاتھ نہیں رکھا جا سکتا لیکن ہمارے ایک ساتھی نے کمال کیا۔ ان حضرت نے کپڑے اتارے اور اس گرداب میں کود پڑے۔ شیخی میں وہ نہانے تو لگے مگر جب وہ باہر نکلے تو ان کی حالت قابل رحم تھی۔ ان کا بدن "سن" ہو گیا تھا۔ اور وہ بری طرح تھر تھر کانپ رہا تھا۔ ½۹ بجے کے بعد ہم مہندری سے روانہ ہو گئے ہماری جیپیں دس پندرہ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چل رہی تھیں۔ کیونکہ اس راستہ میں اس سے زیادہ تیز رفتار خطرہ کا باعث بن جاتی ہے لیکن پھر بھی ہمارے مشاق ڈرائیور نے کبھی کبھی میٹر کی سوئی کو ۱۸ نمبر تک پہنچا دیا۔ مہندری سے آگے برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیاں نمایاں طور پر نظر آنے لگیں اور ہماری نظروں کا مرکز بن کر رہ گئیں۔

بعض جگہ تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے پہاڑوں کی چوٹیوں پر چاندی کا ملمع کر دیا گیا ہو۔ دور سے وہ نظارہ بہت عجیب معلوم ہوتا ہے۔ جب سورج کی شعاعیں برف کی مغرور چوٹیوں کے گلے میں والہانہ طور پر اپنی باہیں ڈالتی ہیں اور چمک دمک سے آنکھیں خیرہ ہو کر رہ جاتی ہیں۔ سورج کی مسلسل تیز نظروں کی حرارت کی تاب نہ لا کر کہیں کہیں برف آب آب ہونے لگتی ہے اور آبشاروں کی شکل اختیار کر لیتی ہے جس سے کچھ اور حسین مناظر پیدا ہو جاتے ہیں۔ مہندری سے چند میل آگے ہی سڑک کے دائیں بائیں گلیشر نظر آنے لگتے ہیں اور پھر ایسی جگہ بھی آجاتی ہے۔ جہاں برف کے بڑے بڑے تودے کاٹ کر راستہ بنایا گیا ہے یہ تودے اوپر سے تو پتھر کی طرح سخت ہوتے ہیں۔ لیکن سورج کی تمازت سے نیچے سے پگھلتے ہیں اور ان کا پانی آخر نالوں کی صورت اختیار کر لیتا ہے چونکہ یہ پانی کافی صاف اور عمدہ ہوتا ہے۔ اس لئے لوگ اسے عام استعمال میں لاتے

Marfat.com

ہیں اور اس اعتبار سے یہاں گدھے، گھوڑے اور خچر بھی برف کا پانی پیتے ہیں۔
اس وادی میں کھیتی باڑی عموماً پہاڑوں پر ہوتی ہے جن پر چھوٹے چھوٹے سرسبز کھیت عجب بہار دیتے ہیں۔ دور سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے قدرت نے پہاڑ پر گھاس کی سبز سیڑھیاں بنا دی ہوں۔ سڑک کے ہر دو جانب دیودار اور چیڑ کے "فلک مآب" درختوں کا ایک لامتناہی سلسلہ نظر آتا ہے۔ جو آخر تک ختم نہیں ہوتا۔ کہیں کہیں راستہ میں گھنے جنگل بھی آتے ہیں۔ مہنرہ سے گیارہ میل پر ایک بستی آتی ہے جسے کاغان کہتے ہیں غالباً اسی کے نام پر اس پوری وادی کو کاغان کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ہونا یہ چاہیے تھا کہ یہ بستی اپنے نام کی مناسبت سے وادی کا دل ہوتی تاکہ اسے پوری وادی کے جمال و رعنائی کا آئینہ دار کہا جا سکتا اور یہ اتنی حسین ہوتی کہ ایک سیاح اسے دیکھ کر تمام وادی کی دلربائی اور حسن کا اندازہ لگا سکتا۔ لیکن افسوس کہ ایسا نہیں ہے۔ یہ بستی وادی کی دوسری بستیوں کے مقابلہ میں جتنی زیادہ عمدہ ہونی چاہیے تھی اتنی ہی کم درجہ کی ہے ضرورت ہے کہ اس سلسلہ میں خاص طور پر توجہ مبذول کی جائے، کاغان سے آگے ہم نے ۱۴½ میل مزید سفر کیا اور ۱۲½ بجے ناران پہنچ گئے جہاں ہمارے لئے دوپہر کا کھانا پہلے سے تیار تھا۔ کھانا کھانے کے بعد کچھ دیر آرام کیا۔ پانچ بجے کے قریب سیر کیلئے نکلے۔ ناران بہت ٹھنڈی جگہ ہے شاید اسی لئے اسے سیاحوں کا مستقر بنایا گیا ہے لیکن یہاں کوئی خاص دلکشی نہیں ہے نہ حسین مناظر ہیں، نہ برفیلی چوٹیاں، نہ کوئی ایسی جگہ بنائی گئی ہے جہاں سے نشیب و فراز پر ایک طائرانہ نظر ڈالی جائے۔ اور نہ ہی ایسی سبزیاں ہیں کہ جن میں آدمی کھو جائے۔ قدرتی طور پر جو چیز موجود ہے بس وہی کچھ ہے۔ انسانی ہاتھوں نے اسکے چہرے سنوارنے اور حسن کو نکھارنے کیلئے کوئی کوشش نہیں کی، ضرورت ہے کہ یہاں پھلوں کے

Marfat.com

باغ لگائے جائیں۔ کوئی سیر گاہ بنائی جائے۔ پہاڑوں پر رنگا رنگ کے پھول اگائے جائیں۔ سڑک کے دونوں جانب چھوٹے چھوٹے پودوں کی خوبصورت روشیں ہوں اور کچھ بلندی پر کسی موزوں جگہ ایسا "پوائنٹ" بنایا جائے جہاں وادی کی دلفریبیوں کا نظارہ کیا جا سکے غرضیکہ ذرا سی محنت اور توجہ سے اسے زیادہ سے زیادہ حسین بنایا جا سکتا ہے۔ اور بہت سی خوشگوار تبدیلیاں کی جا سکتی ہیں ورنہ موجودہ صورت میں دلچسپی کے سامان بہت کم ہیں۔ فاران میں اگرچہ ایک چھوٹا سا بازار ہے۔ اور ایک دو گھٹیا قسم کے ہوٹل ہیں لیکن ضرورت کی چیزیں نہیں ملتیں۔ یہاں کوئی اخبار نہیں آتا ہے دوسری اشیاء تو درکنار کھانے کیلئے فروٹ تک نہیں ملتے۔ یہاں تک کہ اچھے سگریٹ تک نہیں ملتے۔ رہائش کیلئے البتہ سرکاری ڈاک بنگلہ اور ریسٹ ہاؤس ہیں جو عام طور پر "فل" رہتے ہیں۔ اگر ٹورسٹ بیورو کی معرفت پہلے سے کمرے محفوظ نہ کرائے جائیں تو رہنے کیلئے کوئی ٹھکانہ نہیں۔

یہاں کی آبادی انتہائی مفلس اور قلاش لوگوں پر مشتمل ہے۔ جو اپنے چند کچے جھونپڑوں میں زندگی کے دن پورے کرتے ہیں۔ آجکل کی ضروریاتِ زندگی کا حصول تو بڑی بات ہے انہیں تو یہ بھی معلوم نہیں کہ آج زمانہ کہاں پہنچ چکا ہے۔ وہ دنیا کی ترقیات سے قطعی بے بہرہ ہیں۔ بہت سے افراد ایسے ملیں گے جو ٹرین کو نہیں جانتے۔ یہاں تک کہ تارکول کی پختہ سڑکیں بھی انہوں نے ابتک نہیں دیکھیں یہ لوگ غربت و افلاس کی ایسی زندہ تصویریں ہیں جنہیں دیکھکر انسانیت مارے شرم کے سرنگوں ہو جاتی ہے۔ مرد، عورتیں، بچے بوڑھے سب افسردہ و پژمردہ دکھائی دیتے ہیں جیسے خوشیوں نے ان کے دلوں میں جنم ہی نہ لیا ہو۔ ان کے مدقوق چہرے اور زرد رنگت دیکھکر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی نے مشین کے

Marfat.com

ذریعے ان کا تمام خون نچوڑ لیا ہو۔ اور انکی روتی بسورتی صورت اور نڈھال نڈھال جسم سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ان کے ہونٹوں پر مسرت کی لہر بھی کبھی نہیں دوڑی اور ان کے بدن کو شاید آرام کا کبھی موقع نہیں ملا۔ چیتھڑوں میں ملبوس یہ انسان عموماً کدال، پھاوڑہ اٹھائے ہوئے ملتے ہیں۔ عورتیں مویشی چراتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ بے پناہ مشقت و محنت کے باعث حسن اگرچہ ان لوگوں میں مفقود ہو ہو چکا ہے لیکن پھر بھی کہیں کہیں پہاڑی حسن کی نمایاں جھلکیاں نظر آجاتی ہیں۔ زیادہ تر لوگوں کے پاؤں میں چمڑے کی بجائے گھاس کی چپلیں ہی ہوتی ہیں۔ وہ کسی جیپ کو آتے ہوئے دیکھکر ایک طرف ساکت و جامد کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور سفید پوش لوگوں کو اسطرح سلام کرتے ہیں جیسے کوئی غلام اپنے آقا کے سامنے نیازمندی سے جھک جاتا ہے۔ حقیقت میں یہ لوگ چلتی پھرتی لاشیں ہیں جنکی حیثیت زندہ درگور سے زیادہ نہیں۔ مردہ کو بھی کفن میں لپیٹ دیا جاتا ہے لیکن ان زندہ نعشوں کو یہ بھی میسّر نہیں۔

قدرت کی کتنی ستم ظریفی ہے کہ جو زندگی بخش ماحول غیروں کو زلیست کی ہزاروں رنگینیاں بخشتا ہے اسکے دامن میں اپنوں کیلئے زندگی کا ایک پھول بھی نہیں۔ جو ماحول غیروں کے دل مسرت و انبساط سے مسرور کر دیتا ہے۔ اس کے پاس اپنوں کیلئے غم کی تاریکیوں کے سوا کچھ بھی نہیں۔ آخر یہ کیا تماشہ ہے کہ بیگانے تو یہاں آکر سکون و اطمینان کی آغوش میں سوتے ہیں اور اپنوں کیلئے اضطراب و بے چینی کے کانٹے دار بستر مقدر ہو چکے ہیں۔

فاران کے بازار اور بستی کے کچے جھونپڑوں سے گذرنے کے بعد جھیل سیف الملوک کا تھوڑا سا پہاڑی راستہ ہم نے تجربتاً طے کیا کیونکہ ہمیں دوسرے دن جھیل پر جانا تھا جہاں جیپ نہیں جاسکتی اسلئے پیدل جانا پڑتا ہے۔ اس دوران میں

Marfat.com

ہمیں جھیل سیف الملوک سے واپس آتے ہوئے دو صاحب ملے جنہوں نے راستہ کے خطرات اور دشواریوں کو کچھ اس انداز سے بیان کیا کہ ہمارے کچھ لوگوں نے تو قطعاً وہاں جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ لیکن کچھ لوگ ہمت بھی بندھانے لگے دو پارٹیاں بن گئیں۔ اور دونوں کی کوشش تھی کہ زیادہ سے زیادہ ممبران ہم خیال ہو جائیں۔ رات گئے تک "کنولینگ" جاری رہی۔ مولوی درویش نے جھیل پر جانے کیلئے اپنی قیمتی جان خطرہ میں ڈالنے کی شدید مخالفت کی لیکن دوسری طرف ولی اللہ واحد مصر تھے کہ ضرور چلا جائے۔ اسی تذبذب کے عالم میں رات بسر کی۔ ۲۴ جولائی کو صبح جب سیف الملوک کیلئے روانہ ہوئے تو چار ممبروں نے نہ جانے کا فیصلہ کر لیا اور پانچ ممبر روانہ ہو گئے۔ درویش انہیں چھوڑنے کے ارادہ سے تھوڑی دور تک گئے تھے لیکن وہ پھر انہیں کے ساتھ ہو گئے اور اپنے سابقہ موقف اور ان ہم خیال ساتھیوں کو بھول گئے جنہیں انہوں نے نہ جانے پر مجبور کیا تھا۔ اب وہ جھیل جانے والی پارٹی کی قیادت کر رہے تھے۔ پہاڑ پر چڑھتے وقت سب سے آگے تھے۔ ان کی یہ حالت دیکھ کر یار لوگوں نے انہیں "مولوی تن سنگھ" کہنا شروع کر دیا۔ اس نام میں کئی رعایتیں مضمر ہیں۔

جھیل کا راستہ خطرناک ضرور ہے لیکن اتنا نہیں جتنا بڑھا چڑھا کر بیان کیا گیا تھا۔ البتہ چند قدم کا ڈھلوان راستہ کافی پُرخطر ہے جس پر سے اگر پاؤں پھسلے تو آدمی ہزاروں فٹ نیچے پانی میں جا گرے۔ راستہ میں کئی جگہ گلیشر بھی ملتے ہیں جس کے اوپر سے گذرنا پڑتا ہے۔ کئی ہزار فٹ بلند دلپسند راستہ طے کرنے کے بعد سیف الملوک پہنچے یہ بہت ہی حسین جھیل ہے جس کی دلفریبیاں اور دلکشیاں بیان نہیں کی جا سکتیں۔ چاروں طرف برف پوش پہاڑ ہیں اور درمیان میں وسیع و عریض پانی کی جھیل! دھوپ میں ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے قدرت نے پانی

Marfat.com

کے اردگرد ایک جھیل بنا دیا ہو۔ سکوں نواز سماں، رومان انگیز ماحول، خوشگوار فضا اور رُوح پرور نظارے! جی چاہتا ہے کہ یہیں عمر گذار دی جائے کافی دیر تک محظوظ ہونے کیبعد واپس ہوئے۔ راستہ میں ایک مقام پر کھانا کھایا جو فاران سے تلی لے کر پہنچ گیا تھا۔ ۴½ بجے کے قریب فاران لوٹ آئے اور اپنے اپنے بستروں میں چلے گئے۔

وادیٔ کاغان، نتھیا گلی اور مری:

۱۵ جولائی کو صبح جب ہم اپنے دبیز کمبلوں اور گرم لحافوں کو خیرباد کہہ کر اٹھے تو ہماری جیپیں ہمارا انتظار کر رہی تھیں کیونکہ آج ہمیں "لالہ زار" جانا تھا۔ ناشتہ کرنے کیبعد دوپہر کا کھانا اور اپنے نئے سفر پر روانہ ہو گئے۔ پہاڑ کے قدم بقدم ایک کچی سڑک ہے جو البیلی رقاصاؤں کی طرح بل کھاتی ہوئی چلی جاتی ہے چنانچہ ہماری جیپیں بھی اس "بانکپن" کے پیش نظر بڑے ادب و احترام سے آہستہ آہستہ رینگتی رہیں۔ فاران سے آگے وادی پھیلنا شروع ہو جاتی ہے اور اس کے دامن کی وسعتوں میں اضافہ ہونے لگتا ہے۔ ذرا ٹھہرئیے! آگے بڑھنے سے پیشتر یہ "سہ آبشاری" منظر بھی دیکھ لیجئے۔ یہ جگہ فاران سے تھوڑی ہی دور آگے ہے۔ دائیں طرف پہاڑ کی خاصی بلندی پر ایک آبشار گر رہی ہے۔ اُسی پانی سے نیچے ایک اور آبشار بن جاتی ہے۔ اور کچھ اور نیچے یہی آبشار تیسری آبشار کو جنم دیتی ہے۔ اوپر نیچے ایک ہی لائن میں ایک ہی پانی کی تین آبشاریں! ایسا لطیف اور نظر فریب منظر پیدا کرتی ہیں کہ آدمی دیکھتا ہی رہ جاتا ہے۔ پہاڑی پتھروں سے ٹکرا کر جب پانی نیچے گرتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی مشاق پنجارہ مہین روئی دھن رہا ہے یا چاند کی سیمیں کرنیں پانی کی شکل میں بہہ رہی ہیں دس میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہم بٹا کنڈی پہنچ گئے۔ یہ جگہ فاران سے بہت

Marfat.com

اچھی ہے اور یہاں ترقی اور توسیع کے بڑے امکانات ہیں کیونکہ کھلے کھلے
میدان ہیں اور زمینیں کافی زرخیز! پانی کی تو کوئی کمی نہیں۔ اسلئے یہاں
بڑی آسانی سے سیرگاہ بن سکتی ہے۔ کھیل کیلئے گراؤنڈ بن سکتے ہیں اور
باغات لگائے جاسکتے ہیں۔ باٹاکنڈی سے آگے ایک یوتھ ہوسٹل بنایا گیا ہے
حکومت کی جانب سے اس قسم کے ہوسٹل وادی میں کئی مقامات پر تعمیر کیئے گئے
ہیں تاکہ انہیں کالجوں اور سکولوں سے آنے والے طلباء کے قیام و طعام کا مناسب
انتظام ہو سکے۔ یوتھ ہوسٹل کے سامنے سے ہی ایک راستہ دائیں طرف جاتا
ہے۔ لالہ زار جانے کیلئے ہماری جیپوں کا رُخ اسی سمت ہوگیا اور پہاڑ پر
چڑھائی شروع ہوگئی۔ راستہ انتہائی تنگ اور چھوٹا۔ پھر اس پر زبردست
چڑھائی! سفر کیا تھا۔ جیپ کے انجنوں کی طاقت کا امتحان تھا۔ ایک دو جگہ
جیپوں نے آگے چلنے سے انکار کردیا اور اپنے پہیوں کو زمین میں گاڑ دیا۔
حقیقت یہ ہے کہ پہاڑوں پر ہمارے سفر کا یہ سب سے زیادہ خطرناک راستہ تھا۔
خوف کیوجہ سے ہنسی مذاق مفقود ہوگیا۔ اور جب تک پرخطر سفر ختم نہ ہو گیا۔ خدا
کی یاد اور کلمہ شریف کے ورد کا سلسلہ جاری رہا۔ اپنی منزلِ مقصود ۔ لالہ زار
پہنچکر ہم نے اطمینان کا سانس لیا اور جب گرد و پیش پر نظر ڈالی تو تھکن اور
خوف کے تمام اثرات زائل ہو گئے۔ لالہ زار بڑی وسیع و عریض جگہ ہے۔ حد نظر
تک زمین پر مخملی گھاس کا حسین فرش بچھا ہوا ہے۔ اور بڑے بڑے سایہ
دار درخت ہیں۔ یہاں پانی کا ایک نالہ بھی ہے جو ایک جگہ نیچے سے اوپر کی
جانب بڑی تیزی سے بہتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ چاروں طرف پہاڑ ہیں جن پر
اکثر و بیشتر اودے اودے بادل یا کالی کالی گھنگھور گھٹائیں اپنے آنچل ڈالے
رہتی ہیں اور پہاڑوں کے نشیب و فراز اور سرسبزی و شادابی کے باعث ہر

Marfat.com

طرف خوبصورت مناظر بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں کچھ بلندی پر ایک موزوں جگہ کا انتخاب کرنے کے بعد ہم نے دریاں بچھادیں اور خوش گپیوں میں مصروف ہو گئے دوپہر کے وقت بھوک لگی تو بندھا ہوا کھانا نکالا گیا۔ مرغی کا بھنا ہوا گوشت! اور لالہ زار کا ماحول! یار لوگوں نے بڑھ چڑھ کر ہاتھ مارے۔

کھانا کھانے کے بعد کچھ لوگ تو ٹہلنے لگے کچھ لوگوں نے تاش کی بازی بچھادی اور کچھ نیند کی آغوش میں چلے گئے۔ کئی گھنٹے تک محظوظ ہونے کے بعد ۵ بجے کے قریب واپس ہوئے اور فی الحقیقت لالہ زار ایک لاجواب مقام ہے جہاں فطرت کی معجز نمائیاں دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ ضرورت ہے کہ یہاں مزید دلربائی پیدا کرنے کیلئے قسم قسم کے پھول لگا کر اُسے اسم بامسمیٰ بنایا جائے رہائش کیلئے عمارتیں تعمیر کیجائیں اور آمدورفت کی سہولت کے پیش نظر سڑک کو وسیع کیا جائے۔ شام کو فاران پہنچے۔ تھوڑی دیر گپ شپ کرنے کے بعد ہم اپنے اپنے بستروں میں چلے گئے۔

تین روز تک قیام کرنے کے بعد ۲۶ جولائی کو صبح واپس ایبٹ آباد کیلئے روانگی ہوئی۔ راستہ چونکہ چھوٹا ہے۔ اسلئے خچروں، گدھوں اور راونٹوں کی آمدورفت سے سخت دشواری پیدا ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات تو پندرہ پندرہ منٹ اور آدھا گھنٹہ تک کیلئے ٹریفک رک جاتی ہے۔ کیونکہ گدھوں کو راہِ راست پر لانا آسان کام نہیں اس کے علاوہ ویسے تو یہاں ون وے (One way) ٹریفک ہے لیکن اسکی کوئی خاص پابندی نہیں کیجاتی۔ ہمارا چشم دید واقعہ ہے کہ مہندری سے درے ہماری جیپیں تیزی سے جارہی تھیں کہ اچانک ایک موڑ کے بعد چند جیپیں دور سے آتی ہوئی دکھائی دیں۔ اتفاق سے وہاں سڑک اتنی چوڑی تھی کہ دو جیپیں برابر سے گذر جائیں چنانچہ بچ گئے۔ معلوم ہوا کہ وہ جنگلات کے سرکاری افسران کی کاریں

Marfat.com

تھیں جو زبردستی آگئی ہوں گی۔ ٹریفک کے قانون کی اس خلاف ورزی کا فوری طور پر انسداد ہونا چاہیے کیونکہ اس سے حادثات کے وقوع کا شدید خطرہ رہتا ہے۔ ہنڈری میں پون گھنٹہ تک ٹھہرنے کے بعد پھر روانہ ہو گئے۔

یہاں آجکل سڑک کی توسیع کا کام جاری ہے جو یقیناً قابلِ تحسین اور مستحق اقدام ہے۔ دوپہر کو بالاکوٹ پہنچے اور سید سے حضرت شاہ اسمٰعیل شہید کے مزار پر فاتحہ پڑھنے کیلئے گئے۔ یہ مزار شہر سے کافی اونچی جگہ پر واقع ہے۔ یہ امر افسوسناک ہے کہ اب تک وہاں جانے کیلئے راستہ بھی نہیں بنایا گیا۔ اور نہ ہی اس عظیم المرتبت الشان کا مقبرہ تعمیر کیا گیا ہے۔ قبر کے اردگرد ایک معمولی چاردیواری ضرور موجود ہے۔ فاتحہ سے فارغ ہو کر ڈاک بنگلہ پہنچے جہاں ہمارے لئے لنچ پہلے ہی سے تیار تھا جلدی جلدی شکم پری کی اور فوراً جیپیں یہیں چھوڑ کر اپنی سابقہ کاروں میں سوار ہو گئے۔ ۲½ کے قریب ہم ایبٹ آباد پہنچ گئے اس وقت وہاں کا موسم نہایت ہی خوشگوار تھا۔ اور موسلا دھار بارش جاری تھی۔ ۴½ بجے سرحد کے وزیر مال رسالدار محمد ایوب خاں نے اپنی کوٹھی پر، ہمارے اعزاز میں "ٹی پارٹی" کا اہتمام کیا تھا۔ اس لئے کپڑے تبدیل کر کے بارش کے دوران میں ان کے ہاں جانا پڑا۔ انہوں نے بڑے پُرخلوص انداز میں ہمارا خیر مقدم کیا اور پھر باتیں شروع ہو گئیں۔ کاغان کی باتیں، دریائے ستلج موڑنے کی باتیں، سرحد کے ترقیاتی منصوبوں کی باتیں! وہ وزیر ہیں لیکن ان کی باتیں 'وزارتی' نہ تھیں۔ ان کی گفتگو میں نہ پیچیدگی تھی نہ گنجلک! نہ ہیر پھیر تھا، نہ سیاست! بلکہ وہ ایک عام آدمی کی طرح صاف طریقے سے مسائل کا تجزیہ کر رہے تھے جس سے قومی تعمیر و ترقی کے پرخلوص جذبہ کا اظہار ہو رہا تھا۔ باتوں کا دور ختم ہوا تو چائے کا دور چلا۔ دعوت چائے کیا تھی دعوتِ طعام ہی تھی۔ چائیں، انڈے، مٹھائی، کیک، توس، بسکٹ

Marfat.com

غرض سبھی کچھ تھا۔ اگر آدمی ایک ایک چیز بھی کھائے تو شکم سیر ہو جائے۔ چنانچہ ہم واقعی شکم سیر ہو گئے۔ وہاں سے رخصت ہو کر اپنی قیامگاہ پر آ گئے۔ بارش اب بھی ہو رہی تھی۔ ۸ بجے کے قریب مینہ تھما تو رات کے کھانے کا وقت ہو چکا تھا پیلیس ہوٹل گئے۔ تھوڑا بہت جو کچھ کھا سکے کھایا اور تاج محل میں انگریزی فلم دیکھنے کے بعد سو گئے۔

۲۷ جولائی کو صبح ناشتہ کیا اور ایبٹ آباد کی سیر کیلئے نکلے۔ ایبٹ آباد ایک خوبصورت "ہل سٹیشن" ہے جو سطح سمندر سے ۴۱۰ فٹ بلندی پر واقع ہے بازار اور سڑکیں کھلی کھلی ہیں اور خوبصورت بھی لیکن غیر معمولی قسم کی چہل پہل، رونق اور گہما گہمی یہاں نظر نہیں آتی۔ دکانوں پر خریدار بھی اکا دکا ہی دکھائی دیتے ہیں۔ چند ضروری اشیاء خریدنے کے بعد ہم واپس آ گئے۔ ہم نے اپنے دوران قیام میں محسوس کیا کہ ایبٹ آباد میں پانی کی سپلائی کا انتظام بہت ناقص ہے۔ ضرورت ہے کہ لائن میں توسیع کیجائے۔ اعلیٰ درجہ کا ایک ہی ہوٹل ہے جس پر ملٹری والوں کا تسلط ہے۔ حالانکہ تقسیم ہند سے قبل یہاں چار بڑے ہوٹل تھے ریلیسٹ ہاؤس، گورنر وسرکٹ ہاؤس اکثر و بیشتر وزیر اعلیٰ کیلئے وقف رہتا ہے ڈاک بنگلہ میں ٹورسٹ آفس قائم ہے۔ حکومتِ سرحد کو چاہیے کہ وہ سیاحوں اور مہمانوں کو ٹھہرانے کیلئے بھی کوئی معقول متبادل انتظام کرے۔ اسکے علاوہ اعلیٰ معیار کے ہوٹل بھی تعمیر کئے جائیں جہاں عام لوگوں کے قیام وطعام کا مناسب بندوبست ہو۔

اب ہمیں نتھیا گلی جانا تھا۔ کاریں تیار کھڑی تھیں۔ ڈائریکٹر ٹورسٹ بیورو مسٹر عبدالقادر صحرائی سے رخصت چاہنے اور ان کا شکریہ ادا کرنے کے بعد ہم کاروں میں سوار ہو گئے۔ صحرائی صاحب بہت دلچسپ شخصیت کے مالک ہیں

Marfat.com

مہمانوں سے بڑے بااخلاق طریقے سے پیش آتے ہیں اور بہت جلد اُن کے دوست بن جاتے ہیں۔ ہمارے خیال میں وہ اس آسامی پر نہایت موزوں ہیں اور اگر حکومت نے انکی حوصلہ افزائی کی اور سہولتیں بہم پہنچائیں تو وہ سرحد کی عزت وشہرت میں اضافہ کا موجب ہونگے۔

ہماری کاریں فراٹے بھرتی ہوئی دوپہر کے وقت نتھیا گلی پہنچ گئیں جہاں "پائنز ہوٹل" میں ہمارے کئی کمرے ریزرو تھے۔

نتھیا گلی بہت ہی فرحت زا، پُرفضا، صحت بخش اور سرد مقام ہے اسلئے موسمِ گرما میں حکومت سرحد کا صدر مقام یہی ہوتا ہے اور مرکزی وزراء بھی مسائل پر ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کرنے کیلئے اکثر اپنی میٹنگوں کا انعقاد یہی ٹھنڈے مقام پر کرتے ہیں۔

نتھیا گلی کو پہلے نتھا گلی کہا جاتا تھا کیونکہ اسے ایک سکھ سردار نتھا سنگھ کے نام سے منسوب کیا جاتا تھا۔ بعد میں اسے نتھیا گلی کہا جانے لگا۔ سطح سمندر سے یہ جگہ آٹھ ہزار دوسو فٹ بلند ہے۔ یہاں کی آبادی بہت محدود ہے۔ ایک معمولی سا بازار ہے۔ ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ اسکے علاوہ ایک دوسرے سے کافی دُور دُور بنگلے اور کچھ سرکاری عمارتیں ہیں اور کچھ دفاتر۔ یہ نتھیا گلی کی کُل کائنات ہے۔ نہ یہاں سینما ہیں اور نہ شاندار بازار اور سڑکیں اور نہ فلک مآب عمارات اور کوٹھیاں۔

لیکن اس کے باوجود نتھیا گلی اپنے اندر بے پناہ دلکشی اور دلفریبی کے ساماں رکھتی ہے۔ اسکی گود حسین نظاروں سے بھرپور ہے۔ ہر طرف [illegible] والی ہے جس سمت بھی نظر دوڑائیے فطرت اپنی تمام رعنائیوں اور جلوہ سامانیوں کے ساتھ بے نقاب دکھائی دیتی ہے۔

Marfat.com

لنچ کھانے کے بعد ایک سرکاری گائیڈ کی معیت میں ہم گورنمنٹ ہاؤس دیکھنے گئے۔ پاکستان بھر میں اپنی نوعیت کی یہ بہترین عمارت ہے۔ عمارت کے چاروں طرف پھولدار پودوں کی روشیں ہیں جو اس خوبصورتی کو دوبالا کر دیتی ہیں اس کے علاوہ گورنمنٹ ہاؤس کے باغ کی آرائش و زیبائش بھی قابل دید ہے اس کے بعد سیکرٹریٹ دیکھا اور واپس اپنے ہوٹل میں آگئے شام کو قریشی صاحب سیکرٹری اطلاعات تشریف لائے اور اپنے ساتھ وزیر اعلیٰ کی کوٹھی پر لے گئے جہاں سردار عبدالرشید صاحب کے علاوہ مسٹر کیانی وزیر صحت بھی موجود تھے۔ دیر تک پریس کی ذمہ داریاں اور فرائض موضوعِ بحث بنے رہے اور پھر پاکستان کے اہم مسائل پر بھی تبادلۂ خیالات ہوا چلتے وقت انکے ساتھ ہی ایک گروپ فوٹو بھی لیا گیا۔ پھر قریشی صاحب ہمیں Lovely Point پر لےگئے جہاں سے پوری وادی صاف نظر آتی ہے۔ اور دور و نزدیک کے نظر نواز نظاروں سے خوب لطف اٹھایا جا سکتا ہے۔ ہم سب نے یہ جگہ بہت پسند کی اور خاصی دیر وہاں بیٹھے رہے۔ ارد گرد کے پہاڑوں کا ذکر کرتے ہوئے قریشی صاحب نے بتایا کہ ان کے ڈھلوانوں میں شکار کیلئے جنگلی مرغ ہرن اور ریچھ وغیرہ مِل جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں کے جنگل عجیب و غریب پرندوں سے بھرے پڑے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ یہاں ایک عجیب اُڑن بلّی ہوتی ہے جو اکثر رات کے وقت ایک درخت سے اڑ کر دوسرے درخت پر بیٹھا کرتی ہے۔ اس کی نرم کھال سے دستانے بنائے جاتے ہیں۔ یہاں سے واپسی پر ہم نے کچھ دیر سڑکوں پر چہل قدمی کی۔ اسی وقت یہاں کچھ تصویر بتاں بھی چلتی پھرتی نظر آجاتی ہیں۔ رات کو ہم نتھیا گلی میں ہی رہے اور پائنز ہوٹل میں قیام کیا یہ ہوٹل بڑی اچھی جگہ واقع ہے۔ صبح کے وقت یہاں سے نانگا پربت کی برف پوش چوٹیاں نظر آتی ہیں۔

Marfat.com

نتھیا گلی صوبہ سرحد میں ہمارے دورہ کا آخری مقام تھا چنانچہ دورہ ختم کرنے کے بعد ۲۸ جولائی کو صبح ہم مری روانہ ہو گئے۔ یہ راستہ بہت ہی دلچسپ اور خوشگوار ہے۔ کہیں چشمے نظر آتے ہیں اور کہیں سرسبز پہاڑوں کی چوٹیاں سڑک کے جوانب آخر تک دیلودار خوب صورت سایہ گستر دکھائی دیتے ہیں۔

نتھیا گلی سے آگے "گلیات" کا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ دو میل کے بعد ڈونگا گلی آتی ہے۔ یہاں "موکش پوری" پہاڑ مٹ ہو رہے۔ اس سے آگے دروازہ کس" نامی ایک مقام آتا ہے۔ جہاں پہاڑوں پر جون کے آخر تک برف پڑی رہتی ہے۔ جھانگلا گلی اور خیرا گلی وغیرہ سے گذرنے کیبعد ہم پنجاب کے گرمائی صدر مقام مری پہنچ گئے۔ ہمیں مری میں چھوڑ کر حکومت سرحد کی سرکاریں کاریں واپس چلی گئیں۔ ہم نے ایک ہوٹل میں چند کمرے کرایہ پر لئے، کھانا کھایا اور دوپہر کو آرام کیا اور شام ہوئی تو سیر کیلئے نکل کھڑے ہوتے۔ مری بہت پر رونق اور ہنگامہ پرور جگہ ہے لیکن موسم کے اعتبار سے نتھیا گلی سے زیادہ صحت افزا نہیں۔ مال روڈ پر پہنچے جہاں کھوے سے کھوا چھلتا ہے۔ شام کو مری کا تمام حسن یہیں سمٹ آتا ہے۔ اور جلووں کی اتنی کثرت ہوتی ہے کہ نگاہ کو فرصت نہیں۔ اسی وقت یہاں ہوٹل، دکانیں، سینما اور بازار ہوتے ہیں۔ سرسراتے ہوئے آنچل لہراتے ہوئے رنگین دوپٹے، معطر ملبوسات شانوں پر بکھری ہوئی مشکبار زلفیں شوخ و رنگین کپڑوں میں ملبوس چاندی سونے کی سرخ و سفید جا مذار النسانی تصویریں مترنم ادائیں اور دلفریب قہقہے حسن و جوانی کا رنگین ماحول۔ غرض ہر طرف زندگی ہی زندگی نظر آتی ہے۔

ہمارے ایک ساتھی مولوی صاحب قبلہ اپنے تمام زہد و ورع سمیت مال روڈ کی ان رنگینیوں میں ڈوب گئے۔ غالباً اس قسم کی بے حجابی اور شوخی و رنگینی

Marfat.com

دیکھنے کا ان کا پہلا اتفاق تھا۔ ہم نے اُن سے لاکھ آگے چلنے کو کہا اور کشمیر پوائنٹ وغیرہ جانے کی ترغیب دی۔ لیکن انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ اور کہا کہ میں یہ مرکزی پوائنٹ چھوڑنے کیلئے ہرگز تیار نہیں۔ ہم انہیں کسی نہ کسی طرح کشمیر پوائنٹ کی طرف لیکر گئے لیکن وہ جلد ہی ہمیں واپس گھسیٹ لائے۔

ہم ایک ہوٹل میں بیٹھے تھے کہ سابق صدر بہاولپور مجلس سید عنایت حسین شاہ صاحب سے ملاقات ہوگئی۔ ان کے اصرار پر رات کو اسی ہوٹل میں ان کے ساتھ کھانا کھایا۔ بہت دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ انہوں نے بہاولپور کے ایک ماہر زراعت اور زمیندار سردار غضنفر اللہ صاحب کو بھی مدعو کر لیا تھا۔ جن کے ساتھ بہت اچھا وقت کٹ گیا۔

رات کو ہم مری ہی میں رہے۔ صبح راولپنڈی روانہ ہو گئے اور ایک دن وہاں قیام کرنے کے بعد پاکستان میل سے واپس بہاولپور پہنچ گئے۔

،ہمارا یہ دورہ چودہ روز تک رہا حکومت کی بیش از بیش سہولتوں کے پیش نظر اس مختصر سے عرصہ میں ہم نے تقریباً تمام سرحد ہی کی سیر کی۔ ہم جہاں سرحد کے ترقیاتی منصوبوں سے متاثر ہوئے وہاں حکومت اور عوام وخواص کی مہمان نوازی کے جذبہ نے بھی ہمارے دل میں گھر کر لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے دل پُرخلوص طریقہ سے ہمارا خیر مقدم کیا اور محبت واخوت کے برادرانہ جذبات کا مظاہرہ کیا۔ اس کی انمٹ یادیں کبھی فراموش نہیں کی جا سکتیں۔ اُن کے اخلاق ومروت نے ایسے گہرے نقوش چھوڑے ہیں جو صفحۂ دل سے مدت مدید تک محو نہ ہو سکیں گے۔

Marfat.com

دلی نامہ

دلی کئی بار لٹی ہے اور کئی بار آباد ہوئی ہے۔ جب لٹتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب کبھی آباد نہیں ہوگی لیکن پھر دیکھتے ہی دیکھتے آباد ہو جاتی ہے اور اسکی رونق و زیبائی میں ایسے چار چاند لگتے ہیں کہ بربادی و ویرانی کا دُور دُور تک پتہ نہیں چلتا۔ ۱۹۴۷ء میں بھی اسکی بربادی کی تاریخ دہرائی گئی تھی۔ شہر پر لُو کا پھر گیا تھا۔ بھرے پڑے گھر خالی ہو گئے تھے۔ محلے اُجاڑ اور گلی کوچے سُنسان تھے سڑکوں پر ہُو کا عالم تھا۔ دِلی دِلی والوں سے خالی ہو گئی تھی۔ کوئی اس آفت ناگہانی پر آنسو بہانے والا بھی نہ تھا۔ صرف آسمان اشک بار تھا۔ اور زمین کا دل دہل رہا تھا۔ اسطرح ایکا ایک پورا شہر کب خالی ہوا ہوگا۔ ہم نے جب پرانے قلعے کے حصار سے نکل کر پالم کے ہوائی اڈے سے پاکستان کی جانب پرواز کی تھی تو آنکھوں کی وادیاں خشک ہو چکی تھیں اور حسرت و یاس کی تصویر بنے ہم یہ سوچ رہے تھے کہ کیا اس مادر گیتی کو دیکھنا اب کبھی نصیب ہوگا یا دِل کہتا تھا کہ ہجر کی یہ رات طویل نہ ہوگی۔ حالات جلدی رو براہ آجائیں گے اور ہم پھر یہاں لوٹ آئیں گے لیکن یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا اور پاکستان کی سرزمین نے قدموں کو ایسا پکڑا کہ پھر قدم اس میں دھنستے چلے گئے۔ قسمت بہاول پور سے وابستہ کر دی گئی تھی۔ یہیں معیشت و معاشرت کے رشتے استوار ہونے تھے۔ اسلئے یہاں کی سرگرمیوں میں ایسا منہمک ہوا کہ پیچھے مڑ کر دیکھنے کی فرصت ہی نہ ملی۔ یوں بھی جس سرزمین میں میرا رزق مقسوم کر دیا گیا تھا اس سے وفاداری میرے نزدیک جزوِ ایمان کی حیثیت رکھتی تھی۔ اسلئے میں نے اسکی خدمت کو اپنی زندگی کا وطیرہ بنالیا۔ کیا سیاسی امور، کیا معاشرتی

Marfat.com

مسائل اور کیا ادبی روحانی اقدار ہر گوشے سے خود کو منسلک کر کے اپنی بساط سے بڑھ کر ان کا رنگ روپ نکھارنے میں لگ گیا تھا۔

دلّی کی یاد : ان تمام مصروفیات کے باوجود یہ کبھی نہیں ہوا کہ دہلی کی یاد میرے دل سے محو ہو گئی ہو۔ کوئی یقین کرے یا نہ کرے لیکن یہ حقیقت ہے کہ گذشتہ ۳۵ سال میں ایسا ایک خواب میں نے نہیں دیکھا جب خود کو دلّی میں نہ پایا ہو گویا میرا جسم یہاں تھا لیکن روح وہیں کے گلی کوچوں میں بھٹکتی پھرتی تھی۔ اور ایسا ہوتا بھی کیوں نہیں، دلی میں میری نال گڑی ہے، میرے بزرگوں کی ہڈیاں وہیں مدفون ہیں، وہاں میں پل کر جوان ہوا ہوں۔ وہیں میرے ذوقِ ادب کی آبیاری ہوئی ہے شاعری پروان چڑھی ہے، صحافت کا چسکا لگا ہے، قلم کاری کا ڈھنگ آیا ہے وہاں میں نے دوستی کی پینگیں بڑھائی ہیں، علماء و فضلاء کی صحبتوں سے فیض یاب ہوا ہوں۔ اساتذہ فن کی آنکھیں دیکھی ہیں، بزرگانِ ادب کی شفقتیں شاملِ حال رہی ہیں جب بھی ان باتوں کا خیال آتا، دِل تڑپ کر رہ جاتا اور رُوح دلّی کا طواف کرنے لگتی، بے بس و بے پر تھا ورنہ اڑ کر نہ جانے کتنی بار وہاں ہو آتا۔ رتیں بدلتی رہیں شباب سے شیب کی منزل آ گئی۔ امنگوں کے گلشن پر خزاں نے ڈیرہ ڈال دیا، لیکن دِلّی کی محبّت ان تمام انقلابات کے بعد بھی زوال پذیر نہ ہوئی، جب بھی کِسی نے دِلّی کا نام لیا تو گویا ع

اک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے

۳۵ سال یونہی تڑپتے بلکتے گذر گئے، کئی بار پروگرام بھی بنا لیکن ہر دفعہ کچھ ایسے موانع حائل ہوئے کہ تکمیلِ آرزو ہوتے ہوتے رہ گئی۔ اب عمر کا سفر اس منزل پر پہنچ چکا ہے، جہاں سے کسی وقت بھی عالمِ بالا کی طرف کوچ ہو سکتا ہے، سوچتا تھا کہ اگر یونہی لیت و لعل ہوتی رہی تو دلّی کو دوبارہ دیکھنے کی حسرت دل

Marfat.com

کی دل میں ہی رہ جائیگی۔

عزم سفر :

لہذا نومبر ۱۹۸۲ء میں یہ مصمم ارادہ کیا کہ جس طرح ہو دلی چلا جائے۔ شاید اس دفعہ تائید غیبی شامل حال تھی اسلئے سوچ کے ساتھ ہی تمام مراحل خود بخود طے ہوتے گئے۔ ایک مہینے کے اندر اندر پاسپورٹ انڈیا کی انڈورسمنٹ (Endorsement) کے ساتھ مل گیا۔ پاسپورٹ کے بعد دلی کا ویزا حاصل کرنا تھا۔ اسکیلئے اسلام آباد کا طویل سفر میرے لئے خاصا دشوار تھا۔ میں نے خدا کا نام لیکر برخوردار شاہد سلمہٗ کو اس کام پر مامور کیا۔ وہ ایک دن میں ویزا لیکر آ گئے۔ ۳۰ر نومبر کو میں لاہور روانہ ہوگیا۔ خیال تھا کہ لاہور سے دلی کا ہوائی سفر کرنے کیلئے ہوائی جہاز میں اپنی نشست مخصوص کرانے میں کچھ دن لگیں گے ایک آدھ دن غیر ملکی کرنسی کی منظوری اسٹیٹ بینک پاکستان سے حاصل کرنے اور ڈالر خریدنے میں بھی صرف ہوگا۔ لیکن یہ تمام مراحل میرے داماد عزیزی منصور الرحمن نے جو سیٹیٹ بنک میں افسر ہیں، ایک دن میں طے کرا دیئے۔ پی۔آئی۔اے میں ۱۸ر دسمبر تک کوئی نشست نہ تھی لیکن انڈین ایرویز سے معلوم کیا تو اس میں یکم دسمبر کو ہی نشست مل گئی۔ اور دہلی سے واپسی کیلئے بھی ۲۰ر دسمبر کی پرواز سے نشست مخصوص ہوگئی۔ گویا صرف ایک رات میں میں نے اپنی بیٹی کے پاس اسٹیٹ بینک آفیسرز کالونی گلبرگ میں گذاری اور دوسرے انڈین ایرویز سے ڈھائی بجے دن کو لاہور سے روانہ ہوکر سوا تین بجے دہلی پہنچ گیا جس سفر کیلئے اتنا طویل انتظار کیا تھا وہ چند منٹوں میں طے ہوگیا۔

دلی میں آمد :

دہلی کا ہوائی مستقر پالم میں ہے۔ یہ وہی پالم ہے جس کے متعلق

Marfat.com

یہ تاریخی فقرہ مشہور ہے۔" بادشاہی شاہ عالم از دلی تا پالم"۔ یعنی مغلیہ سلطنت کا زوال ہوا تو مغلوں کی بادشاہی جو کبھی پورے ہندوستان پر محیط تھی۔ آخر میں دہلی سے پالم تک سمٹ کر رہ گئی تھی۔ ۱۹۴۷ء میں میں نے اسی ہوائی اڈے سے دہلی کو خیر باد کہا تھا۔ یہاں جہاز سے اُترا تو آج سے ۲۵ سال پہلے کا وہ وقت میری نظروں کے سامنے آگیا جب یاس وحرماں کی چادر میں لپٹا ہوا دہلی سے رُخصت ہونے یہاں آیا تھا۔ اُس وقت یہاں کی فضا بہت غمگین و اُداس تھی۔ خطرات و اندیشوں کے مہیب سائے ہر طرف منڈلا رہے تھے۔ عجیب کسمپرسی کا عالم تھا۔ نہ رونق تھی نہ چہل پہل۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیتی جاگتی لاشیں ہوا کے دوش پر دہلی پار بھیجی جا رہی ہیں۔

ہر شخص اجنبی تھا:

آج یہی ہوائی اڈہ رنگ و نور کا مسکن نظر آرہا تھا، ہر طرف بہار کا سماں تھا خوشی سے تمام چہرے دمک رہے تھے۔ میرے قدم تو ہوائی اڈے کی عمارت کی طرف اُٹھ رہے تھے لیکن سوچ ماضی کے خیالات میں گم تھی۔ استقبالیہ ہال میں پہنچا تو خیالات کا سلسلہ منقطع ہوا اور نظریں کسی آشنا کی تلاش میں اِدھر اُدھر پھرنے لگیں لیکن یہاں ہر شخص اجنبی تھا۔ کوئی شناسا صورت دکھائی نہ دی اس وقت بلا ارادہ یہ شعر میری زبان پر آگئے

باایں ہمہ کہ آئے ہیں دورِ بہار میں — تصویرِ درد، پیکرِ رنج و محن ہیں ہم
اس سے زیادہ اور ستم ہوگا کیا شہاب — اپنے وطن میں آج غریب الوطن ہیں ہم

جن صاحب کے ہاں مجھے قیام کرنا تھا وہ بھی نظر نہ آئے۔ وہ دکھائی بھی کیسے دیتے۔ میں نے اپنی روانگی کے متعلق دس بارہ دن پہلے جو خط انہیں لکھا تھا وہ انہیں مل ہی نہ سکا تھا۔ بہرحال اب مجھے یہاں سے نکلنے کی فکر ہوئی۔ سُنا تھا کہ کسٹم اور سیکورٹی کا عملہ مسافروں کو بہت تنگ کرتا ہے۔ لیکن مجھے نہ دہلی اور نہ

Marfat.com

لاہور میں ایسے بدخو عملے سے سابقہ پڑا۔ بڑی خوش اسلوبی سے دونوں جگہ چیکنگ کے فرائض انجام دیئے گئے۔ اور کسی قسم کی پریشانی نہیں ہوئی۔ ہاں دہلی کے ہوائی اڈے پر اپنی آمد اور دہلی میں داخلے کے سلسلے میں ضروری اندراجات کی کاروائی میں بڑی دیر لگی حالانکہ اس غرض کیلئے تین چار کاؤنٹر تھے جن پر مسافروں کی قطاریں لگی ہوئی تھیں لیکن متعلقہ عملہ بہت سست رفتار تھا جس نے اپنی کاروائی میں پورے دو گھنٹے صرف کر دیئے۔ وہاں سے فارغ ہو کر میں نے ہوائی اڈے پر ہی اسٹیٹ بینک آف انڈیا کی شاخ سے ڈالروں کو انڈین کرنسی میں تبدیل کرایا اور ہوائی اڈے سے باہر آ کر ٹیکسی میں بیٹھ کر حضرت نظام الدین اولیاؒ کی بستی روانہ ہو گیا۔

بَدلی ھوئی دِلّی :

پالم کے ہوائی اڈے سے بستی نظام الدین کا فاصلہ دس بارہ میل سے کم نہ ہو گا۔ پہلے تو یہ سارا راستہ جنگل بیابان تھا لیکن اب ہر طرف عمارات کا سلسلہ چلا گیا ہے۔ بستی حضرت نظام الدین بھی پہلی سی نہیں رہی۔ یہاں کئی پر رونق کالونیاں آباد ہیں پتہ ہی نہیں چلتا کہ پُرانی بستی کدھر ہے۔ صرف ایک نشانی باقی تھی جو سبز گنبد کے نام سے لودھی روڈ کے سرے پر واقع ہے۔ اُسے دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ بستی آ گئی۔ یہیں سے بستی کی طرف راستہ مُڑتا ہے لیکن آبادی کی رونق میں وہ پُرانا راستہ تلاش کرنا مشکل ہوا تو پُوچھ گچھا کر میں پُرانی بستی میں پہنچا اور اپنے میزبان کے گھر پر دستک دی۔ ایک نوجوان باہر نکلے۔ اُن کو اپنے متعلق بتایا تو انہوں نے ٹیکسی میں سے میرا سامان اتار کر گھر میں رکھا۔ ٹیکسی کا کرایہ ۳۵ روپے بنا تھا جو میں نے ادا کر دیا۔ پھر اپنے میزبان حکیم سید حسین صاحب کے متعلق دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ لکھنؤ گئے ہوئے ہیں۔ دو چار روز میں آئیں گے، البتہ انکے بڑے بھائی عُلامہ اخلاق حُسین تشریف رکھتے تھے۔ جو نوجوان سب سے پہلے مجھے ملے تھے یہ انکے ہی فرزند

Marfat.com

تھے۔ انہوں نے اندر جاکر میرے آنے کی اطلاع دی تو علامہ صاحب باہر آئے اور مجھے گلے سے لگالیا۔ یہ کافی ضعیف ہو چکے ہیں اور مجھ سے عمر میں بہت بڑے ہیں لیکن مجھے دیکھکر وہ بھی حیران رہ گئے۔ کہنے لگے میاں تم بھی بڈھے ہو گئے حالانکہ ہمارے سامنے کے تو تم بچے ہو۔ جوانی سے بڑھاپا آگیا۔ میں نے کہا" انقلابات ہیں زمانے کے"۔ جب دہلی سے گیا تھا تو میری عمر ۲۵ سال تھی اور اب پورے ساٹھ سال ہو چکے ہیں۔ بڑھاپے کو کب تک روکتا۔ ان سے دیر تک گپ شپ ہوتی رہی۔ یہ عرب سرائے کے پرانے خاندان سادات سے تعلق رکھتے ہیں۔ تصنیف و تالیف علامہ صاحب کا پرانا مشغلہ ہے۔ انہوں نے متعدد کتابیں تصنیف کی ہیں جن میں حضرت محبوب الٰہی کے متعلق انکی کتاب بڑے معرکے کی ہے۔ پچھلے دنوں انہوں نے بزرگانِ دین کے بعض ملفوظات کا اس اعتراض کا کہ یہ فرضی اور الحاقی واقعات پر مشتمل ہیں بڑا مدلل اور مسکت جواب لکھا تھا جو معارف میں قسط وار چھپا تھا اور اب کتابی صورت میں انجمن ترقی اردو ہند بکڈپو چھاپ رہی ہے۔

صبح میں نے پہلی فرصت میں دہلی میں اپنی آمد کی اطلاع پولیس آفس میں دی جو بستی حضرت نظام الدین سے تھوڑے فاصلے پر ہے۔ اس غرض کیلئے دفتر میں ایک علیحدہ حصہ مخصوص ہے جہاں اہل کار متعین ہیں۔ ایک خاتون اہل کار نے میری رپورٹ درج کی اور چند منٹوں میں مجھے فارغ کر دیا۔

میں دو ایک روز تو حکیم صاحب کے انتظار میں ان کے گھر لال محل سے باہر نہ نکلا اور اس دوران علامہ صاحب کے کتب خانے کی چھان پھٹک کرتا رہا۔

درگاہ حضرت محبوب الٰہی پر حاضری:

پھر آخر کار یہ سوچ کر کہ کب تک یونہی بیٹھا رہوں گا حضرت محبوب الٰہی کی درگاہ پر حاضری دی۔ دستور کے مطابق زائرین پہلے حضرت

Marfat.com

محبوب الٰہی کے مرید طوطئ ہند حضرت امیر خسرو کے مزار پر فاتحہ پڑھتے ہیں اور بعد میں حضرت محبوب الٰہیؒ کے مزار اقدس پر حاضر ہوتے ہیں۔ اسی طریقہ پر میں نے عمل کیا۔ فاتحہ کیبعد میں امیر خسروؒ کے مزار کے پہلو میں کھڑا سوچ رہا تھا کہ یہ مرید اپنے مُرشد کے کیسے سچے عاشق تھے کہ انکی مفارقت برداشت نہ کرسکے اور حضرت محبوب الٰہیؒ کی وفات کے چھ ماہ بعد ہی رحلت فرما گئے۔

یہاں سے باہر آیا تو سامنے ایک حجرے کے قریب امام خواجہ اسلام الدّین بیٹھے نظر آئے۔ درگاہ حضرت محبوب الٰہیؒ کی مسجد کی امامت پشت ہا پُشت سے انہیں کے خاندان میں چلی آرہی ہے۔ وہ مجھے دیکھتے ہی پہچان گئے اور بڑے تپاک سے ملے۔ اِن سے ہمارا ننھالی رشتہ بھی ہے۔ ان سے سلام دعا کرکے حضرت محبوب الٰہی کے آستانہ پر حاضر ہوا یہاں اور بھی بہت سے زائرین آستاں بوسی میں مصروف تھے جن میں کئی غیر مسلم بھی تھے۔ یہ اس درویش خدامست کا آستانہ ہے جس کے آگے بڑے بڑے کجکلاہوں کی گردنیں خم ہوئی ہیں جو زندگی بھر نہ کسی بادشاہ کے دربار میں گیا اور نہ کسی کے جاہ و جلال سے متاثر ہوا۔ حضرت محبوب الٰہی نے کئی بادشاہوں کا عروج و زوال دیکھا۔ ہرایک ان کا عقیدت کیش تھا اور اُنکی کفش برداری کی تمنا رکھتا تھا۔ سُلطان علاؤالدین خلجی نے خود حاضرِ خدمت ہوکر نیاز حاصل کرنے کی خواہش کی تو آپ نے کہلا بھیجا کہ ہم درویش ہیں اور بادشاہوں اور مسلمانوں کیلئے دعا کرتے ہیں۔ بادشاہوں کا یہاں کیا کام؟ میرے گھر کے دو دروازے ہیں اگر وہ میرے پاس آیا تو ایک دروازے سے وہ آئیگا اور دوسرے دروازے سے میں باہر نکل جاؤنگا۔

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی حضرت بابا فریدالدین گنج شکرؒ کے مرید و خلیفہ تھے۔ پاک و ہند میں سلسلۂ چشتیہ کو آپ کی ذات سے بڑا عروج حاصل

Marfat.com

ہوا۔ سلسلۂ نظامیہ کی داغ بیل بھی آپ نے ڈالی۔ آپ کی درگاہ کے ساتھ ایک باؤلی ہے جہاں کبھی تیراک اپنے کرتب دکھاتے تھے لیکن اب ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہاں کوئی نہیں آتا۔ مزار سے ملحق مسجد ہے جسے علاؤ الدین خلجی نے تعمیر کر دایا تھا مزار سنگ مرمر کا ہے جس کے گرد سنگِ مرمر کا ہی برآمدہ ہے۔

میں آپ کے آستانے پر فاتحہ پڑھ کر باہر آیا تو عجب کیف و وجد کا عالم طاری تھا۔ آستانے کے سامنے بیٹھے ہوئے قوال یہ غزل گا رہے تھے:

بخوبی ہمچو مہ تابندہ باشی　　　بملک دلبری پائندہ باشی

میرے قدم خود بخود آستانے کا طواف کرنے لگے۔ پھر میں نے درگاہ کے آس پاس نظر ڈالی جہاں کئی اُمراء و وزراء کی قبریں ہیں جنھوں نے مرتے وقت یہ خواہش کی تھی کہ انہیں حضرت کے جوار میں دفن کیا جائے۔ انہیں میں شاہجہاں کی بیٹی جہاں آرا کی بھی قبر ہے جس کے بازوؤں میں شاہ جہاں نے قدم توڑا تھا۔

دادا پیر اور اُستاد کے مزارات پر حاضری:

یہاں سے میں اپنے دادا پیر حضرت شاہ کریم رضا اور اپنے استاد حضرت مولوی عبدالسلام نیازی کے مزارات پر حاضر ہوا۔ یہ دونوں مزارات پہلو بہ پہلو بستی حضرت نظام الدین کی ایک گلی میں ہیں۔ یہاں آیا تو اشک ہائے عقیدت آنکھوں سے یوں نکل پڑے جیسے نہ جانے کب سے وہ یہ بہانہ ڈھونڈ رہے تھے۔ میں وہاں کھڑا تصور میں آج سے پچاس سال پہلے کا زمانہ یاد کرتا رہا۔ حضرت شاہ کریم رضا چشتی نظامی گیا (بہار) کے رہنے والے اور میرے والد کے مرشد تھے۔ ہم نے اپنے حقیقی دادا کو تو دیکھا نہیں تھا۔ انہیں کو دادا کہتے تھے اور دادا سمجھتے تھے۔ والد مرحوم کا معمول تھا کہ اتوار کے اتوار ہمیں انکی خدمت میں لے جایا کرتے تھے۔ یہ ہفتے بھر ہمارے لئے تبرکاً سینت سینت کر رکھا کرتے

Marfat.com

اور جب اتوار کو ہم اُن کے پاس جاتے تو بڑی محبّت سے وہ تبرک ہمیں دیتے اُن کا منحنی جسم اور نورانی شکل آنکھوں میں پھر رہی تھی، پھر یکایک نظروں کے سامنے مولانا عبدالسلام نیازی کی تصویر آگئی۔ وہی بھاری بھرکم جسم، ڈاڑھی مونچھ صاف، سر گھٹا ہوا، ململ کا چادر اوڑھے، آنکھیں بند کئے گاؤ تکیے سے لگے نیم دراز ہیں۔ کسی بات پر طرارہ سا آتا ہے، اُٹھ کر بیٹھ جاتے ہیں اور کہتے ہیں "خدا خوش رکھے ....." پھر جو تقریر شروع ہوتی ہے تو ہماری بیٹھک کے باہر آنے جانے والوں کا ٹھٹ کا ٹھٹ لگ جاتا ہے۔ گفتگو کے اسرار و رموز کسی کے سمجھ میں آئیں یا نہ آئیں لوگ گم سم بنے گھنٹوں کھڑے رہتے ہیں۔ پھر ۱۹۴۷ء کا وہ وقت یاد آیا جب ہم دہلی سے رخصت ہو رہے ہوتے ہیں اور مولانا میرے والد کو تسلّی دیتے ہوئے کہتے ہیں "میاں سیّد تمہارے بیٹے ٹھیک کہتے ہیں جاؤ سدھارو" انہیں خیالات میں محو تھا کہ کسی صاحب کی آمد سے تصوّرات کا یہ تار ٹوٹ گیا۔ اور میں جلدی فاتحہ پڑھ کر وہاں سے آگیا۔

مرزا غالب کے مزار پر:

یہاں سے چل کر میں مرزا غالب کے مزار پر آیا جسے اب ایک خوبصورت مقبرے کی شکل دے دی گئی ہے یہ مقبرہ بستی حضرت نظام الدین میں چونسٹھ کھمبے والی مشہور عمارت کے متّصل ہے جسے چار دیواری میں محصور کر کے الابلا سے محفوظ کر دیا گیا ہے۔ یہ اس عظیم شاعر کا مرقد ہے جس کی رفعتِ تخیّل آسمان سے بلند تھی۔ بے ساختہ میری زبان پر علامہ اقبال کا یہ شعر آگیا ؎

آہ تو اُجڑی ہوئی دِلّی میں آرمیدہ ہے۔
گلشنِ ویمر میں تیرا ہمنوا خوابیدہ ہے۔

جس زمانے میں علامہ اقبالؒ مرزا غالب کے مزار پر گئے تھے اس وقت

Marfat.com

واقعی دلی کا یہ حصہ اُجاڑ تھا لیکن اب تو یہاں آبادی کا اتنا شور ہے کہ مرزا صاحب قبر میں یہ کہتے ہونگے۔

پس از مردن بھی دیوانہ زیارت گاہ طفلاں ہے
شرارِ سنگ نے تربت پہ میری گُل فشانی کی !

غالب اکیڈمی ایک ادبی مرکز:

ایصالِ ثواب کیلئے یہاں بھی فاتحہ خوانی کی اور پھر ٹہلتا ٹہلتا اس خولصورت اور شاندار عمارت کے سامنے آکھڑا ہوا جو غالب اکیڈمی کہلاتی ہے۔ یہ ہمدرد دواخانہ دہلی کے حکیم عبدالحمید صاحب کی مرزا غالب سے خوش عقیدگی کی مظہر ہے بستی نظام الدین میں مرزا غالب کے مزار کے ساتھ غالب اکیڈمی قائم کرکے انہوں نے اس جگہ کو ادبی حیثیت دے دی ہے۔ دہلی کی اکثر ادبی تقریبات یہیں منعقد ہوتی ہیں۔

پرانے دوست مل گئے:

میں اس عمارت میں داخل ہو کر اکیڈمی کے دفتر میں گیا تو یہاں چند حضرات بیٹھے ہوئے نظر آئے۔ میں نے اُن سے اپنا تعارف کرایا تو اُن میں سے ایک صاحب میرا نام سُن کر ایک دم کھڑے ہوئے اور یہ کہہ کر کہ مجھے گلزار دہلوی کہتے ہیں، مجھ سے لپٹ گئے۔ یہ میرے بچپن کے ساتھی تھے لیکن ۲۵ سال بعد ایک نظر میں نہ وہ مجھے پہچان سکے تھے اور نہ میں یہ سوچ سکتا تھا کہ یوں اچانک وہ مجھے مل جائیں گے۔ گلزار سرگباشی تربھون ناتھ زتشی زار دہلوی کے فرزند ہیں۔ دہلی کی ادبی محفلوں کی جان اور دہلی کی گنگا جمنی تہذیب کے نمائندہ و یادگار ہیں۔ انہوں نے دہلی کے اساتذہ حضرت بیخود، نواب سائل، پنڈت امرناتھ ساحر اور پنڈت برجموہن کیفی دتاتریہ کی آنکھیں دیکھی ہوئی ہیں۔ میں بھی ان اساتذہ کا صحبت یافتہ ہوں اور انکی جوتیاں سیدھی کرنے کا مجھے فخر حاصل ہے۔ ۱۹۴۶ء سے قبل جب پنڈت

Marfat.com

برجھوبن کیمنی دتاتریہ انجمن ترقی اردو ہند سے وابستہ تھے تو میں روز دوپہر کو ان کے دفتر میں دریا گج حاضر ہوتا ۔ اور شام کو ان کے ساتھ جامع مسجد دہلی تک آتا ۔ گلزار بھی وہاں آیا کرتے تھے ۔ دیر تک ہم پرانی یادیں تازہ کرتے رہے ۔ اس گفتگو میں ہم اتنے محو ہوئے کہ وہاں بیٹھے ہوئے دوسرے حضرات کی طرف توجہ ہی نہ ہو سکے ۔ جب کافی دیر یونہی گذر گئی تو پاکستان سے آئے ہوئے مشہور خطاط جناب صادقین جو وہاں موجود تھے، ضبط نہ کر سکے اور بولے کیا اتفاق ہے کہ غالب اکیڈمی کی بدولت دو بچھڑے ہوئے دوست یہاں آن ملے ۔

تعارفی تقریب :

غالب اکیڈمی کے معتمد ذہین نقوی اسم بہ مسمّٰی ہیں ۔ وہ کوئی ایسا موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے جب کوئی شاعر، ادیب یا دانشور یہاں آئے اور یہ اسے اکیڈمی میں مدعو کر کے کوئی محفل آراستہ نہ کریں ۔ چنانچہ از راہِ کرم میری آمد پر انہوں نے دوسرے دن ہی ایک تعارفی تقریب کا اہتمام کیا اور ساتھ ہی پاکستان سے آئی مشہور سکالر ڈاکٹر عالیہ امام، مشہور پاکستانی خطاط صادقین محمد اور روسی نژاد اردو کے ادیب مرزا اشرف الدین کو بھی مدعو کر لیا ۔ یہ غالب اکیڈمی کی طرف سے تعارفی تقریب ہی نہیں پاک بھارت دوستی کی علامت بھی تھی ۔ چنانچہ اگلے دن جب میں حسبِ پروگرام وہاں پہنچا تو عمارت کی بالائی منزل میں کئی احباب تشریف فرما تھے ۔ اور میز چائے اور دوسری اشیائے خوردنی سے سجی ہوئی تھی ۔ اس کام و دہن کی آزمائش کے بعد ذہین نقوی صاحب نے ہمیں غالب اکیڈمی کا وہ حصہ دکھایا جہاں اردو خطاطی، اردو ٹائپ اور اردو مختصر نویسی کی کلاسیں جاری ہیں ۔ غیر سرکاری سطح پر اردو کی ترویج کا یہ عملی منصوبہ دیکھ کر میں بہت متاثر ہوا ۔ پاکستان میں فنِ خطاطی کی تربیت کا کوئی سرکاری یا غیر سرکاری

Marfat.com

ادارہ نہیں۔ لوگ نجی طور پر اپنے شوق سے خطاطی سیکھتے ہیں۔ دہلی میں حکیم عبدالحمید صاحب نے یہ ادارہ قائم کر کے ہندوستان میں اُردو کے مستقبل کو تاریک ہونے سے بچالیا ہے۔ یہاں تربیت حاصل کرنے والے کیلئے سرکاری و نیم سرکاری محکموں میں ملازمت کے مواقع حاصل ہو گئے ہیں۔ خاص طور پر تصنیف و تالیف و صحافتی سرگرمیوں میں اچھے خوش نویسوں کے فقدان کی وجہ سے جو خلا پیدا ہوتا جارہا تھا ان کلاسوں کے اجرا سے اس کا بھی کافی حد تک سدِّباب ہو گیا ہے۔

خطاطی کی یہ کلاسیں دیکھنے کے بعد ہم نیچے ہال میں آئے جہاں پہلے سے کافی لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ سب سے پہلے ذہین نقوی صاحب نے آج کی تقریب کی غرض و غایت پر روشنی ڈالی پھر باری باری ہماری گل پوشی کی گئی۔ گلزار دہلوی نے میرے گلے میں پھولوں کا ہار ڈالا اور پھر حاضرین سے یہ کہہ کر میرا تعارف کرایا۔

"میرے دوست شہاب دہلوی ہیں تو اسی دِلی کے روڑے لیکن انہیں ۳۵ سال بعد اپنے وطن میں لوٹنے کی توفیق ہوئی ہے۔"

پھر انہوں نے میری تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملانے شروع کر دیئے دیگر حضرات نے بھی تقریریں کیں اور ان سب کا موضوع "پاک ہند دوستی" تھا۔ مجھے اظہارِ خیال کی دعوت دی گئی تو میں نے اپنی تقریر کا آغاز اس قطعے سے کیا۔

پسِ شباب امنگوں نے لی ہے انگڑائی
قرار بن کے شبِ انتظار آئی ہے
وطن میں آیا ہوں پینتیس سال بعد شہاب
خزاں رسیدہ چمن میں بہار آئی ہے

جسے سب نے پسند کیا۔ تقاریر کے اختتام پر جناب ڈاکٹر برکاتی صاحب نے غالب اکیڈمی کی طرف سے غالب کے موضوع پر شائع ہونے والی تین کتب کا تحفہ دیا

Marfat.com

مجھے میں نے شکریئے کے ساتھ قبول کیا۔ کتابیں یہ تھیں۔ غالب اور آہنگِ غالب، غالب اور ذکا، تلمیحاتِ غالب۔

مُلاقاتوں کا سلسلہ :

اس تقریب کی کاروائی اور تصاویر دہلی کے اخبارات میں چھپیں تو بہت سے لوگوں کو دہلی میں میری آمد کا پتہ چل گیا اور پرانے دوست و احباب مجھ سے ملنے میرے مستقر پر آنے لگے۔ اس کے بعد رہی سہی کسر میرے عزیز دوست برادرم گلزار دہلوی نے نکال دی۔ یہ میرے ساتھ گلی گلی کوچے گھومتے پھرتے رہے اور لوگوں سے ملواتے رہے۔ یہ سب سے پہلے مجھے مفتی عتیق الرحمٰن کے ہاں لے گئے جو علامہ شبیر احمد عثمانی کے بھتیجے ہیں اور آجکل صاحبِ فراش ہیں۔ دلی کے علمی و مذہبی حلقوں میں انکی بڑی قدر و منزلت ہے۔ انہوں نے دہلی میں ندوۃ المصنّفین کے نام سے ایک اشاعتی ادارہ بھی قائم کر دکھا ہے۔

مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کے بعد ہم بیگم جمیلہ قدوائی کے ہاں گئے۔ یہ یو۔پی کے مشہور قدوائی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں اور آج کل دہلی میں اپنی سماجی سرگرمیوں کی وجہ سے کافی مقبول ہیں۔ انکی رہائش مٹیا محل میں خواجہ محمد شفیع کے مکان میں ہے۔ مکان کے نچلے حصے میں تو انہوں نے لڑکیوں کیلئے دستکاری کا ایک سکول کھول رکھا ہے اور بالائی منزل میں خود رہتی ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ پچھلے دنوں خواجہ شفیع صاحب مع اپنی بیگم آئے تھے۔ انکی بیگم تو یہاں آکر اپنے آنسو ضبط نہ کر سکیں۔ میں نے کہا اپنی جگہ سے یہ تعلق خاطر کیسے نہیں ہوتا۔ انہوں نے میرے انکار کے باوجود بالاصرار بڑی پر تکلف چائے پلائی جس کمرے میں ہم بیگم قدوائی کے پاس بیٹھے تھے۔ یہ وہی کمرہ تھا جس میں ہر اتوار اردو مجلس کی محفلیں گرم ہوتی تھیں۔ میں نے یہ بتایا تو بیگم صاحبہ بولیں کہ اگر گلزار صاحب چاہیں تو ایسی محفلیں اب بھی قائم ہو سکتی ہیں۔ میں نے

Marfat.com

گلزار کو ٹہوکا دیتے ہوئے کہا۔ پھر کیا ارادہ ہے ؟"

یہاں سے ہم مفتی شوکت فہمی کے ہاں گئے۔ یہ تقسیم سے پہلے بھی "دین دنیا" نکالتے تھے۔ اب بھی دین و دنیا اُن کے قبضے میں ہے۔ مفتی صاحب بڑے وضع دار لوگوں میں سے ہیں اور لئے دیئے رہتے ہیں۔ شور شرابے اور ہنگاموں سے دور۔ پہلے بھی انہوں نے کسی ہنگامہ آرائی میں شرکت نہیں کی۔ اور اب بھی ان باتوں سے انہیں دلچسپی نہیں۔ علمی آدمی ہیں۔ تصنیف و تالیف میں لگے رہتے ہیں یا پھر اپنی صحافتی ساکھ کو قائم رکھنے کیلئے "دین و دنیا" کے اداریئے اور شذرات لکھتے ہیں۔ جو خاصے جاندار ہوتے ہیں۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اُن کے صاحبزادے اب اِن کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ انہوں نے مجھے دین و دنیا کے کئی شمارے عنایت کئے جن کی پہلی کی سی آب و تاب تو نہیں لیکن یہ کیا کم ہے کہ اردو سے حکومتِ ہند کی روایتی بے مروّتی کے دور میں بھی مستقل مزاجی سے نکل رہا ہے۔

مفتی شوکت فہمی صاحب بڑے خلوص و محبت سے ملے۔ دیر تک پاک و ہند تعلقات پر تبادلہ خیالات کرتے رہے۔ دہلی میں میرے اخبار الہام کا دفتر "دین و دنیا" کے پڑوس میں تھا بس اتنا فرق تھا کہ وہ چھتہ شیخ منگلو کے سرے پر تھا اور میرا دفتر عین جامع مسجد کے سامنے حافظ ہوٹل کے اوپر تھا۔

مفتی صاحب سے مل کر میں گلزار دہلوی کے ساتھ بستی نظام الدین میں آ گیا۔ وہاں جانے کیلئے جامع مسجد سے ہی بسیں جاتی ہیں اور بستی تک بس کا کرایہ چالیس پیسے ہے۔ جامع مسجد سے دوسرے اطراف میں بھی بسیں جاتی ہیں۔ جامع مسجد کے بس اڈے تک بسیں لال قلعہ سے گذر کر دریبہ کلاں سے ہوتی ہوئی آتی ہیں۔ البتہ یہاں سے جانے والی بسیں اُردو بازار سے مچھلی والان سے ہوتی ہوئی دریا گنج میں مڑ جاتی ہیں۔

Marfat.com

گلزار دہلوی نے دوسرے دن اپنے دفتر آنے کی مجھے دعوت دی۔ اور ساتھ یہ بھی کہا کہ وہ کسی کے ذمے لگائیں گے جو مجھے آکر اُن کے دفتر لے جائیں گے وہ ایک سرکاری پرچہ "سائنس کی دنیا" کے ایڈیٹر ہیں جو کونسل آف سائنٹیفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ کی طرف سے اردو میں شائع ہوتا ہے۔ اس میں سائنسی موضوعات پر بڑے تحقیقاتی اور معلومات افزا مضامین شائع ہوتے ہیں۔ رسالہ حسنِ صوری کے علاوہ حسنِ معنوی سے بھی آراستہ ہے۔ سائنس کی دنیا کا دفتر قرول باغ میں ہے نئی نئی عمارات کی بہتات سے یہاں کا رنگ بدل گیا ہے۔ صرف پھوسا کالج کی پرانی بلڈنگ اب بھی وہاں نظر آتی ہے۔

"سائنس کی دنیا" کے دفتر میں :

پروفیسر ابرار صدیقی کی معیت میں جب اگلے دن سائنس کی دنیا کے دفتر میں پہنچا تو گلزار میرے منتظر تھے۔ کچھ اور صاحبان کو بھی انہوں نے مدعو کیا ہوا تھا۔ سب سے میرا تعارف ہوا اور اس کے بعد انہوں نے بتایا کہ کن مشکلات سے گذر کر انہوں نے حکومت کو اردو میں رسالہ نکالنے پر آمادہ کیا ہے۔ انہوں نے اپنے دفتر میں آویزاں بعض یادگار اور تاریخی نوعیت کی تصاویر بھی دکھائیں جن میں ایک ایسا گروپ فوٹو بھی تھا جس میں برصغیر کے تقریباً تمام تر نامور شعراء، ادیب اور اساتذہ سخن بیٹھے نظر آرہے تھے۔ اردو کے سلسلے میں ان کے بعض معرکوں کی روداد سن کر میں بہت متاثر ہوا۔ اور یہ کہتے بنی :

"دلی کا اب وقار ہیں گلزار دہلوی"

حقیقت میں اُردو کی مؤثر وکالت کر کے اس کا حق منوانے کیلئے گلزار دہلوی نے جو خدمات انجام دی ہیں وہ لائقِ تحسین ہیں۔ اللہ کرے زورِ بیان اور زیادہ۔ انہوں نے چائے اور ہمہ اقسام فواکہات سے میری تواضع کی۔ میرے اور دوسرے

Marfat.com

احباب کے ساتھ فوٹو بھی کھنچوالئے۔ اور چلتے وقت "سائنس کی دنیا" کا ایک سیٹ بھی دیا۔ یہاں سے وہ ہمیں لیکر نئی دہلی سے ہوتے ہوئے نظام الدین آپہنچے جہاں انہوں نے ایک ہوٹل میں ہمیں کھانا کھلایا اور پھر اگلے دن ملنے کا کہہ کر ہم سے رخصت ہو گئے۔

هجرت کی یاد آگئی:

اگلے دن صبح ناشتہ کر کے میں خود بس میں بیٹھ کر جامع مسجد کیلئے روانہ ہو گیا تاکہ یہاں آزادانہ پھر سکوں اور قرب وجوار کی ہر چیز دیکھ سکوں بستی نظام الدین سے جامع مسجد تک کا راستہ کبھی غیر آباد تھا۔ سوائے کچھ آثارِ قدیمہ کے کوئی عمارت نظر نہیں آتی تھی۔ اسی راستے پر پرانے قلعے کے آثار تھے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ کورو پانڈو کے زمانے کا ہے۔ بعد میں جس کی دیواریں اور دروازے شیر شاہ سوری نے بنوائے تھے۔ اس کی دیواروں پر چڑھ کر پوری دہلی کا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔ اس قلعے کے پاس سے گذرا تو آج سے ۴۵ سال پہلے کا وہ وقت یاد آگیا جب میں اپنے خاندان کے ہمراہ یہاں پناہ لینے آیا تھا۔ تقسیم ہند میں جو فسادات ہو رہے تھے ان سے بچنے کیلئے دلی کے مسلمانوں نے جہاں پناہ لی تھی جہاں تقریباً تمام مسلم آبادی سمٹ آئی تھی۔ اس زمانے کی باتیں یاد کرتا ہوں تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ عجیب نفسا نفسی کا عالم تھا۔ کسی کو کسی کا ہوش تھا نہ فکر۔ دہلیں اموات بھی واقع ہو رہی تھیں اور پیدائش کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ سب کام خود کرنے پڑ رہے تھے۔ سقے پانی کی ایک مشک پانچ روپے میں ڈال رہے تھے۔ جو عارضی نلکے وہاں لگائے گئے تھے ان پر اس قدر ہجوم تھا کہ کئی کئی گھنٹے اپنی باری کا انتظار کرنا پڑتا تھا۔ کھانے پینے کی اشیاء ناپید تھیں۔ نوجوان ہتھیلی پر سر رکھ کر شہر جا کر کچھ سامان لے آیا کرتے تھے۔ پھر اس نو آباد عارضی بستی میں دکانیں بھی لگ گئیں

Marfat.com

جس کے پاس جو جمع جکڑی تھی وہ آہستہ آہستہ ختم ہونے لگی تو عورتوں نے اپنے زیور اونے پونے بیچنے شروع کر دیئے۔ اس بے لبسی سے فائدہ اٹھانے وہاں کچھ لالچی مہاجن بھی آنے لگے جنہوں نے ہزاروں روپے کے زیورات چند ٹکوں میں خرید لئے۔

حق گو، عاشق خدا:

یادوں کے یہ دریچے کھلے تھے کہ میں قلعہ کے دروازے کے سامنے مسجد شیر شاہ کے پاس آیا۔ یہاں سے کچھ فاصلے پر شیر منڈل ہے جہاں کبھی لائبریری تھی اور جہاں سے گر کر ہمایوں نے وفات پائی تھی۔ قلعہ کی دیوار کیساتھ اگر بستی نظام الدین کی طرف جائیں تو ایک ٹیلے پر ایک مزار ہے کبھی اس پر جھنڈے ہی جھنڈے لٹکے ہوتے تھے۔ اب یہاں جھنڈے نظر نہیں آتے اور مزار بھی کچھ نظروں سے اوجھل ہو گیا ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ بزرگ سلطان محمد تغلق کے عہد میں ہوئے ہیں۔ سلطان محمد تغلق نے اپنا لقب سلطان عادل رکھ لیا تھا اور چاہتا تھا کہ سب اسی لقب سے اُسے پکاریں۔ ان بزرگ سے بھی اس نے کہا کہ اسے سلطان عادل کہیں لیکن آپ نے کہا کہ میں ایک ظالم کو عادل نہیں کہہ سکتا۔ اس پر سلطان نے غضبناک ہو کر انہیں قلعہ سے نیچے گرا دیا تھا۔ ان کا نام شیخ شہاب الدین تھا اور حق گو۔ عاشق خدا کے نام سے مشہور تھے۔

قلعہ کے آس پاس اور نظام الدین تک آبادی ہی آبادی نظر آتی ہے۔ عظیم الشان عمارات کا سلسلہ دور تک چلا گیا ہے جن میں سرکاری دفاتر بھی ہیں اور شاپنگ سنٹر بھی۔ پرانے قلعے کے پاس ہی نیشنل سپورٹس کلب ہے اور یہیں انٹرنیشنل نمائش گاہ ہے۔ غرض وہ سڑک جسکی ویرانی کی وجہ سے یہاں سے دن ڈھلے گزرتے ہوئے ڈر لگتا تھا، وہاں اب رات کے وقت دن کا گمان ہوتا ہے اور دن رات ٹریفک آرک جارک رہتی ہے۔

Marfat.com

خونی دروازہ نادر شاہی دور کی یاد دلاتا ہے:

راستے میں دہلی گیٹ پر نظر پڑی جو اسی طرح موجود ہے جس طرح ۱۹۴۷ء سے پہلے تھا۔ اس کے قریب ہی خونی دروازہ ہے جو نادر شاہی دور کی یاد دلاتا ہے جب دہلی میں قتل عام ہوا تھا اور یہاں کٹے ہوئے سر اور خون میں لت پت لاشیں لٹکا دی گئیں تھیں تاکہ یہ خون ریزی دیکھ کر دہلی کے لوگ کسی قسم کی مزاحمت کی جرأت نہ کر سکیں۔

یہاں سے ہوتا ہوا دریا گنج میں داخل ہوا۔ فیض بازار کے آخری سرے پر جامع مسجد کی طرف جانے والا راستہ ہے۔ اگر اس طرف نہ مڑیں تو ایڈورڈ پارک کے پاس سے گذر کر لال قلعہ کے پاس آجاتے ہیں جہاں سے ایک راستہ کشمیری دروازہ کی طرف چلا جاتا ہے اور اگر لال قلعہ سے مغرب کی طرف مڑ جائیں تو چاندنی چوک میں جا نکلتے ہیں اور یہاں پتھر والا کے سامنے جامع مسجد کی طرف چلے جاتے ہیں۔ جامع مسجد سے بس اڈے پر جانے والی بسیں یہیں سے گذرتی ہیں۔

جامع مسجد مقید معلوم ہوتی ہے:

میں نے یہاں بس سے اتر کر ایک نظر اپنے دفتر والی عمارت پر ڈالی جواب رہائشی ہوٹل بن گیا ہے۔ دفتر کے نیچے جو دکانیں پہلے تھیں اب بھی وہی ہیں صرف دکاندار وہ نہیں۔ جامع مسجد کے نیچے جو دکانیں تھیں وہ وہاں سے ہٹا کر ہرے بھرے صاحب کے مزار کے قریب ایک جدید مارکیٹ میں منتقل کر دی گئی ہیں جس کا نام مینا بازار رکھا گیا ہے۔ یہاں کپڑے لتے اور آرائشی سامان سے لیکر عام اشیاء ملتی ہیں۔ جامع مسجد کے چوطرف ایک آہنی جنگلا لگا دیا گیا ہے۔ مجھے یہ اچھا نہیں لگا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا جامع مسجد کو مقید کر دیا گیا ہے۔ اسکی بلند و بالا سیڑھیاں اگرچہ صاف ستھری ہیں لیکن جو روایتی رونق تھی وہ باقی نہیں رہی۔ جامع مسجد سے دریبے

Marfat.com

کو جانے والا راستہ جو مشرقی دروازے کی طرف سے ہو کر جاتا ہے وہاں کباڑیوں کی دکانیں ہیں۔ جامع مسجد کا اردو بازار پہلے کی طرح آباد ہے۔ مولوی سمیع اللہ اگرچہ اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں لیکن انکی دکان پر اب بھی ادیبوں اور شاعروں کا اجتماع ہوتا ہے۔ دوسرے بڑے کتب خانے بھی جوں کے توں موجود ہیں۔ مذہبی علمی و ادبی کتب کا کاروبار خاصے بڑے پیمانے پر ہوتا ہے مچھلی والان کی رونق پہلے سے دوبالا ہے۔ ایڈورڈ پارک میں ایڈورڈ کے بت کی جگہ سبھاش چندر بوس کا بت نصب ہے جنہوں نے انگریزوں کے خلاف آزاد ہند فوج بنائی تھی۔ ایڈورڈ کو بھاگتے ہوئے گھوڑے پر سوار دکھایا گیا تھا جسے دیکھکر دلی والے کہا کرتے تھے کہ انگریز اسی طرح سر پر پیر رکھ کر بھاگیں گے۔ اسکی جگہ سبھاش چندر بوس کا بت اس بات کی علامت ہے کہ ہندوستانیوں کے جذبۂ حریت اور تحریک آزادی نے انگریزوں کو یہاں سے رختِ سفر باندھنے پر مجبور کیا۔

شاہ کلیم اللہ جہان آبادی کے ہاں حاضری:

سرمد شہید اور ہرے بھرے صاحب کے مزارات کیساتھ مولانا شوکت علی محوِ خواب استراحت ہیں۔ یہاں سے تھوڑے فاصلے پر مولانا ابوالکلام آزاد کا مزار ہے قریب ہی دو بڑے تالاب ہیں جس میں رات کی چاندنی میں جامع مسجد کا عکس صاف دکھائی دیتا ہے۔ اس سے آگے شاہ کلیم اللہ جہاں آبادی کی خانقاہ ہے۔ اس کے متولی ماہنامہ آستانۂ دہلی کے مدیر و مالک مستحسن فاروقی تھے جنہوں نے تقسیم سے پہلے ہی خانقاہ کی خدمت کیلئے خود کو وقف کر رکھا تھا اور بعد میں بھی اسکی دیکھ بھال اور حفاظت انکے ذمہ رہی۔ انہوں نے اپنے ذاتی صرف سے اس خانقاہ کو از سر نو تعمیر کیا ہے۔ حضرت شاہ کلیم اللہ جہاں آبادی بادشاہ فرخ سیر کے عہد (بارہویں صدی) کے بزرگ ہیں۔ انہوں نے قطب مدینہ حضرت

Marfat.com

شیخ محی الدین یحیٰی مدنی سے خرقۂ خلافت حاصل کیا تھا آپ صاحب تجرید و توحید اور بے شمار کمالات کے مالک تھے۔ آپکی تصانیف میں سواء السبیل و تسنیم، عشرۂ کاملہ، قرآن القرآن، مرقع شریف اور کشکول کو مشائخ چشت کے دستور العمل کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ آپ کے خلفاء میں دیگر حضرات کے علاوہ حضرت مولانا نظام الدین مراد آبادی بڑے جلیل القدر چشتی بزرگ گذرے ہیں جن کے فرزند مولانا فخرالدین فخرجہاں دہلوی چشتیہ نظامیہ سلسلے کی ہندوستان میں تجدید کی اور انکے خلفاء میں قبلۂ عالم خواجہ نور محمد مہاروی بہت با اثر بزرگ تھے۔

سرمد شہید جنہیں علمائے نے قتل کرادیا تھا:

ہرے بھرے صاحب کے متعلق تو مجھے سوائے اسکے کچھ معلوم نہیں کہ وہ سید اور ایک قانع و متوکل بزرگ تھے البتہ سرمد شہید کے متعلق علم ہے کہ یہ وہی صاحب ہیں جنکی رباعیات مشہور ہیں، کہا جاتا ہے کہ یہودی الاصل تھے بعد میں مسلمان ہو گئے اور علوم ظاہری و باطنی کی تکمیل کر کے مرتبۂ کمال کو پہنچ گئے جذب و سکر کی حالت میں رہتے تھے۔ پہلے کسی ہندو بچہ کی محبت میں مبتلا ہوئے پھر عشق مجازی سے عشق حقیقی کا رنگ چڑھ گیا۔ آخر میں کار اد نکار یہاں تک پہنچا کہ ہمہ اوست اور من خدایم من خدایم کے کلمات زبان سے نکلنے لگے۔ علمائے وقت نے اس پر گرفت کی اور قتل کا فتویٰ اورنگ زیب بادشاہ کے سامنے پیش کر کے اُن کے قتل کا حکم جاری کرادیا۔ اپنے قتل سے پہلے سرمد شہید نے یہ شعر کہا تھا۔

سر جدا کرد از تنم شوخی کہ یا من یار بود
قصہ کوتہ کردہ ورنہ دردِ سر بسیار بود

میں ان سب بزرگوں کے مزارات پر فاتحہ پڑھ کر جامع مسجد میں گیا جو ہندوستان کی سب سے بڑی اور سب سے مشہور جامع مسجد ہے۔ کسی زمانے میں اسکا رنگ

Marfat.com

سُرخ ہر آنے والے کو اپنی طرف کھینچتا تھا۔ لیکن اب معلوم ہوتا ہے کہ یہ دہلی والوں کی بے التفاتی پر نوحہ کناں ہے۔ اس کا رنگ و روغن بالکل پھیکا پڑ چکا ہے۔ اور کہنگی و شکستگی کے آثار جگہ جگہ نمایاں ہیں شاہ جہاں کی بنائی ہوئی یہ جامع مسجد جو کبھی دِلّی کا دِل تھی۔ اب یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کسی نے اس کو مسوس کر رکھ دیا ہو میں نے امام سید عبداللہ کے متعلق دریافت کیا تو پتہ چلا کہ وہ اس وقت موجود نہیں اِن سے ہمارے دیرینہ خاندانی تعلقات ہیں۔ ان کے والد سید حمید میرے والد کے گہرے دوست تھے۔ کسی نے بتایا کہ سید عبداللہ تو نہیں۔ انکے چھوٹے بھائی سید عباداللہ اس وقت یہاں ہیں۔ اگر میں چاہوں تو اِن سے مِل سکتا ہوں۔ یہ میرے شاگرد رہے ہیں۔ لہٰذا وہ جہاں بیٹھے تھے میں خود وہاں چلا گیا۔ پہلے تو وہ استعجاب و حیرانی کے عالم میں مجھے تکتے رہے لیکن جب پہچان گئے تو بڑے خوش ہوئے معلوم ہوتا تھا کہ یا تو محرومی کا شکار ہیں یا پھر ذہنی آسودگی میسّر نہیں اسلئے وہ اپنے بھائی کا شکوہ کرتے رہے۔ میں نے انکی بہنوں کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے بتایا کہ ایک بہن جو میری شاگرد ہیں پرانے گھر میں رہتی ہیں۔ چنانچہ میں چتلی قبر اُن کے گھر گیا۔ اپنے متعلق کہلا کر اندر بھیجا تو انکی بہن نے مجھے اندر بلوا لیا۔ اُن کے خاوند بھی موجود تھے۔ وہ ملکر بہت خوش ہوئے۔ پھلوں اور چائے سے میری تواضع کی۔ کچھ دیر میں وہاں بیٹھ کر سوئی والان کی طرف چل دیا۔ سوئی والان کا راستہ چتلی قبر سے ہو کر جاتا ہے۔

چتلی قبر کی حقیقت :

بازار کے بیچوں بیچ یہ تین قبریں ہیں جو چتلی قبر کے نام سے مشہور ہیں۔ انکے متعلق ایک دفعہ میں نے شاہ عبدالعزیز کے ملفوظات میں پڑھا تھا کہ اِن میں سے ایک قبر حضرت مجدد الدین کی ہے جو شاہ جہاں آباد کی

Marfat.com

آبادی سے پہلے حیات تھے۔ کچھ لوگ آپ کو فرزندان حضرت خواجہ معین الدین چشتی میں سے بتاتے ہیں۔ بہرحال میں اُن کے پاس سے "السلامُ علیکم یا اھل القبور" کہتا ہوا گذرا اور سوئی دالان جا نکلا۔ یہیں ماہنامہ "آستانہ" کا دفتر ہے۔ تقسیم کے وقت یہ جامع مسجد کے مشرق میں ڈاکخانہ کے پاس ہوا کرتا تھا لیکن اب سوئی دالان میں منتقل ہو گیا ہے۔ مستحسن فاروقی تو اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ آستانہ اب انکی اہلیہ اور انکے صاحبزادے کی نکلتا ہے۔ فاروقی صاحب میرے نہایت شفیق دوستوں میں سے تھے۔ انہوں نے دہلی میں انڈو جرمن کیمیکل ورکس کے نام سے ادویات کا کاروبار شروع کیا تھا۔ جنگ عظیم دوئم میں جب برطانیہ جرمنی سے نبرد آزما تھا اور ہندوستان میں جرمنی نام کی ہر چیز مشکوک نظروں سے دیکھی جانے لگی تھی تو فاروقی صاحب نے بھی اپنی فرم کا نام انڈو جرمن کی بجائے انڈو جینوئن کیمیکل ورکس لیا تھا اشتہاری ادویات کا کاروبار شاید ہی اس سے زیادہ دہلی میں کسی اور کا ہو۔ ۱۹۴۶ء میں انہوں نے آستانہ کے نام سے ایک ماہنامہ جاری کیا جو تصوف اور مذہب کے رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ کبھی کبھار میرا نعتیہ کلام بھی اس میں چھپتا تھا۔ افسوس فاروقی صاحب اس دنیا میں نہ رہے۔ خیال تھا کہ اُن کے صاحبزادے سے مل کر اُن سے تعزیت کروں گا۔ لیکن وہ دفتر میں نہ تھے۔ تھوڑی دیر بعد انکی اہلیہ آ گئیں جن کو میں نے اپنا تعزیتی پیغام بھجوا دیا۔ اُن کے مینجر بڑے صاحب ذوق آدمی ہیں انہوں نے چائے اور سگریٹ سے میری تواضع کی اور ہندوستان میں اُردو کے ادبی رسائل کے مستقبل پر کافی دیر باتیں کرتے رہے۔ یہاں سے رخصت ہو کر میں نے اپنے گھر کی راہ لی۔ محلہ بھوجلا پہاڑی میں کسی قسم کی تبدیلی میں نے محسوس نہ کی صرف دکانوں کی تعداد بڑھ گئی ہے۔ میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایک ایک کو گھورتا ہوا گذر گیا۔ لیکن کوئی شناسا شکل نظر نہ آئی۔ اسطرح اجنبیوں کی طرح میں

Marfat.com

اپنے گھر کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اس کا نقشہ بدلا ہوا تھا۔ نہ بیٹھک دکھائی دیتی تھی اور نہ ڈیوڑھیوں کے آثار تھے۔ وہاں اندر تک دکانیں ہی دکانیں تھیں باہر کے بغلی حصے کی شکل بھی تبدیل ہوگئی تھی اور اس میں کئی مکان بن چکے تھے۔

خدا کی قدرت دیکھی :

میں وہاں کھڑا حسرت بھری نظروں سے مکان کو دیکھ رہا تھا کہ ایک صاحب میرے پاس آکر بولے "کیا دیکھتے ہیں ؟" میں نے آہ بھر کر کہا "خدا کی قدرت دیکھتا ہوں۔ کبھی یہ گھر میرا تھا اور میں اس میں رہا کرتا تھا اور آج اس کے مالک آپ ہیں اور آپ یہاں رہتے ہیں" وہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگے۔ پھر یہ معلوم کرکے کہ میں پاکستان سے آیا ہوں مجھے گھر کے مردانہ حصے میں لےگئے اور میرے لئے چائے منگوائی۔ میں نے ان کے بزرگوں کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے جو نام گنوائے یہ سب میرے زمانے میں زندہ تھے لیکن اب جہاں میں نہ تھے۔ بہر حال یہ چاندی والوں میں سے تھے اور خلیفہ اسماعیل کے پوتے یا نواسے تھے۔ جو کمرہ میرے استعمال میں آتا تھا۔ اُس میں انہوں نے چاندی کا تار کھینچنے کا کارخانہ لگایا ہوا تھا۔ میں نے انہیں بتایا کہ یہیں سے کھڑکی میں جھانک کر میں نے ایک مجذوب کو فسادات کے زمانے میں تڑپتے ہوئے دیکھا تھا۔ شہر میں کرفیو لگا ہوا تھا۔ کوئی گھر سے باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ ہر گلی پر فوجی گورکھوں نے ناکے لگائے ہوئے تھے اس عالم میں ایک مجذوب نہ جانے کہاں سے آگئے۔ وہ شاید محلہ قبرستان میں جا رہے تھے۔ میں نے اپنے کمرے کے قریب ہی گولی چلنے کی آواز سنی تو گلی کی طرف جو کھڑکی تھی اُس میں سے جھانک کر باہر دیکھا کہ کوئی مجذوب خون میں لت پت تڑپ رہا ہے۔ آہستہ آہستہ انکی زبان سے نکل رہا تھا۔ "ہائے بابو جی ! میں نے تمہارا کیا کیا تھا۔ مجھے کیوں مارا ؟" ہماری بےبسی کا اندازہ کیجئے کہ ہم تڑپتی ہوئی لاش دیکھ

Marfat.com

رہے تھے اور کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ اتنے میں دیکھا فوجی گورکھا اس تڑپتی ہوئی لاش کے پاس آیا اور اس نے اپنی سنگین نکال کر اس کو بھونکنی شروع کی اور جب تک اس غریب کی جان نہیں نکل گئی وہ اسطرح اسکے جسم میں سنگین بھونکتا رہا جیسے وہ کسی گھولس کو مار رہا ہو۔

شاندار مکان کٹڑا بن گیا ہے۔

یہ سن کروہ صاحب بولے ہاں میں نے اپنے بزرگوں سے یہاں کسی مجذوب کے گولی لگنے کا قصہ سنا تھا۔ انہوں نے مجھے مکان کا اندرونی حصہ بھی دکھایا اور چھت پر بھی لیکئے تاکہ یہاں سے میں مکان کے بڑے حصے کا جائزہ لے سکوں میں نے دیکھا کہ اس حصے کی دیواروں پر کائی جمی ہوئی ہے شاید ۲۵ سال میں ایک دفعہ بھی اسکی مرمت نہیں ہوئی تھی۔ میری آنکھوں میں آنسو جھلکتے دیکھے تو بولے یہ حصہ کارپوریشن کی تحویل میں ہے اور اس میں کم وبیش پندرہ بیس گھر آباد ہیں ان لوگوں نے اتنے شاندار مکان کو کٹڑا بنا دیا ہے۔ میں دل مسوس کر رہ گیا اور اس گھر کو جس میں میرا بچپن اور جوانی گذری تھی بن دیکھے ہی واپس آگیا کیونکہ اس کی حالتِ زار دیکھنے کی مزید تاب نہیں تھی۔ میرے مکان کے قریب ہی اس مجاہد (عبدالرشید) کا مکان تھا جس نے شردھانند کو قتل کیا تھا۔ لیکن اب یہ مکان بھی نظر نہیں آیا۔ شاید اسکی بھی ہیئت تبدیل ہو چکی تھی۔

یہاں سے رخصت ہوا تو ایک نظر اتحاد منزل والی عمارت پر ڈالی جو انجمن کے نام سے مشہور ہے اور میرے پھوپھا حاجی احمد حسن مرحوم تحصیلدار دہلی کی یادگار ہے۔ اہل محلہ میں اتحاد و یگانگت پیدا کرنے کیلئے انہوں نے اسکی بنیاد ڈالی تھی چنانچہ ایک زمانے تک محلے کی یہ روایت قائم تھی کہ محلے کا کوئی جھگڑا اور تنازعہ کسی عدالت یا تھانے میں نہیں جاتا تھا۔ اہل محلہ اسی انجمن میں اپنے قضیئے پیش کرتے تھے۔

Marfat.com

اور محلہ کی سربرآوردہ شخصیتیں باہم افہام وتفہیم سے طے کرادیتی تھیں۔ اتحاد منزل کے قریب ہی میر فتح علی شاہ گردیزی کا مزار ہے جو بارہویں صدی ہجری کے بزرگ ہیں۔ اتحاد منزل میں مسجد بھی ہے اور دینی درسگاہ بھی جس میں محلّے کے بچّے قرآن مجید پڑھتے ہیں۔ محلّے کی ایک گلی جس میں میرے پھوپھا کا مکان تھا۔ آج بھی ان کے نام سے موسوم ہے اور انکے نام کی تختی بھی گلی کے سرے پر لگی ہوئی ہے۔

محلّہ بھوجلا پہاڑی اور محلہ چوڑی والان کے درمیان ہندو واڑہ ہے۔ جہاں خالص ہندو آبادی ہے۔ جامع مسجد اور اپنے دفتر جانے کا یہی میرا راستہ تھا۔ آج بھی اسی راستے سے ہوتا ہوا چوڑی والان میں اپنے والد کے پیر بھائی سیّد عاشر اشرف کے ہاں گیا۔ یہ پہلے تو مجھے پہچانے نہیں اور مجھے کوٹ پتلون میں ملبوس دیکھ کر ناراض ہوتے رہے۔ اور یہی کہتے رہے کہ میرے ہاں کسی انگریز کا کام نہیں۔ میں خاموشی سے یہ سب لعنتیں سنتا رہا۔ جب میں ان کے قریب جاکر بیٹھ گیا اور انہوں نے غور سے مجھے دیکھا تو مسکرا کر بولے" اچھا میاں شہاب ہو۔ کب آئے ؟ بھائی مجھے تو اب سنائی دیتا ہے نہ دکھائی دیتا ہے پھر وہاں بیٹھے ہوئے ایک معتقد سے مخاطب ہو کر بولے۔ جاؤ جلدی چائے بنا کر لاؤ۔ یہ میرے بھتیجے ہیں، پاکستان سے آئے ہیں میں نے چائے بنانے سے اُن صاحب کو منع کر دیا۔ اور یہ کہہ کر وہاں سے تھوڑی دیر بعد آگیا پھر کسی وقت آؤں گا تو چائے پیئوں گا۔ اس وقت مجھے نظام الدین واپس جانا ہے غرض وہاں سے جامع مسجد آکر نظام الدین جانے والی بس میں بیٹھ کر روانہ ہوگیا شام ہو چلی تھی۔ یہاں گلزار دیگر احباب کے ساتھ نہ جانے کب سے میرا انتظار کر رہے تھے۔ ان کے ساتھ رات گئے تک چائے کے دور بھی چلتے رہے۔ اور شعر وسخن کی محفل بھی گرم رہی۔

<u>**جیسے دھلی آیا ھی نہیں**</u> : جوں جوں دن گزرتے جاتے تھے اور حکیم

Marfat.com

سید حسین صاحب کی آمد میں تاخیر ہو رہی تھی۔ میرے ساتھ علامہ بھی پریشان و متفکر تھے۔ انہیں امید تھی کہ پانچ چھ دسمبر تک حکیم صاحب آجائیں گے۔ لیکن جب ایک ہفتے سے زیادہ ہو گیا تو انکی تشویش بھی بڑھی۔ کہنے لگے اتنے دِن تو وہ کبھی دہلی سے باہر نہیں رہتے اور اگر اتفاق سے دیر ہو جائے تو فوراً خط لکھ دیتے ہیں۔ لیکن اَب کے اُن کا کوئی خط نہیں آیا چنانچہ انہوں نے صُبح اُٹھ کر سب سے پہلے دو تین مقامات پر حکیم صاحب کے نام خط لکھے جن میں انہیں میری آمد کی اطلاع بھی دی گئی تھی اور فوراً واپسی کی تاکید بھی کیگئی تھی۔ یوں تو میں نے حکیم صاحب کا انتظار کر کے دہلی کا گشت لگانا شروع کر ہی دیا تھا لیکن انکی عدم موجودگی کا احساس پھر بھی روز بروز شدت اختیار کر رہا تھا۔ حقیقت میں میرے لئے دہلی میں اگر کوئی شخصیت سب سے زیادہ پُرکشش تھی تو وہ حکیم صاحب کی ہی ذات تھی جب تک وہ واپس نہ آئے میں یہی سمجھتا رہا کہ میں ابھی دہلی میں نہیں آیا۔ تاہم دہلی کا گشت جاری تھا اور میں ہر روز کسی نہ کسی طرف نکل جاتا تھا۔ اپنے تمام تغیرات کے باوجود دہلی میرے لئے نئی نہیں تھی۔ جدھر جاتا نئی عمارات کے ہجوم میں کوئی نہ کوئی پرانی عمارت نظر آجاتی جسے دیکھ کر میں اسکے حدود اربعہ کو سمجھ جاتا تھا۔ ایک دن میں نے قطب صاحب کا ارادہ کیا اور یہ معلوم کر کے کہ بستی نظام الدین صاحب سے قطب صاحب کیلئے کونسی بس جاتی ہے میں قطب صاحب روانہ ہو گیا۔ قطب صاحب کا فاصلہ یہاں سے دس بارہ میل سے کم نہ ہو گا۔ ہمارے زمانے میں یہ سارا راستہ بھی غیر آباد تھا۔ لیکن اب یہاں دُور تک آبادی چلی گئی ہے۔ حدِ نگاہ تک فلک بوس عمارات کا سلسلہ نظر آتا ہے۔ یہاں تک کہ تغلق آباد جسے آج سے سینکڑوں سال پہلے سلطان محمد تغلق نے بسانے کی کوشش کی تھی۔ اور اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا تھا۔ اب یہ صرف آباد ہی نہیں بلکہ اسکی آبادی کے ڈانڈے پرانی اور

Marfat.com

نئی دہلی سے آملے ہیں۔

حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کے آستانے پر حاضری:

قطب مینار سے ہوتی ہوئی ہماری بس مہرولی پہنچی۔ یہاں اچھی خاصی شہر کی سی رونق ہے۔ ایک دوگلیوں سے گذر کر میں قطب الاقطاب حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ میں پہنچا۔ یہ سلطان الہند غریب نواز حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحؒ کے خلیفہ اور حضرت بابا فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کے مرشد ہیں۔ کہتے ہیں کہ اکثر آپ کے گھر میں فقر و فاقہ کا عالم ہوتا تھا۔ اور جب کئی کئی روز اسیطرح گذر جاتے تو آپکی اہلیہ محترمہ پڑوس کے بقال کی بیوی سے کچھ قرض لاکر کھانے کا انتظام کرتیں۔ ایک دن بقال کی بیوی نے بی بی صاحبہ سے طنزاً کہاکہ اگر میں تم کو قرض نہ دوں تو تمہارے بچے بھوکے مرجائیں۔ قطب صاحب کو معلوم ہوا تو آئندہ قرض لینے سے منع کردیا۔ اور فرمایا کہ حجرے کے طاق میں سے بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھ کر جس قدر کاک کی ضرورت ہو نکال لیا کرو اور بچوں کو کھلا دیا کرو چنانچہ ضرورت کے وقت ایسا ہی کرتی تھیں۔ اور ہمیشہ حسب ضرورت کاک نکل آیا کرتے تھے۔ اس وجہ سے آپ بختیار کاکیؒ مشہور ہوگئے۔ یہ بھی کہا جاتاہے کہ آپ لبِ دریا اپنے محبین کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ کسی نے کہاکہ اس وقت گرم گرم کاک ہوتے تو کتنا مزا آتا۔ یہ سن کر آپ نے دریا میں ہاتھ ڈالا اور گرم گرم کاک نکالکر اُن کے سامنے رکھ دیئے جس کے بعد آپ کو کاکی کہا جانے لگا۔ کاک ایک طرح کے میٹھے بسکٹ ہوتے ہیں اور آپ کے عرس پر تبرک میں یہی کاک بٹتے ہیں۔

حضرت خواجہ قطب الدین کاکی بڑے با اثر بزرگ تھے۔ وجد و سماع سے آپ کو خاص نسبت تھی۔ اکثر قوالی سنتے سنتے آپ پر حال وارد ہوجاتا اور کئی کئی پہر تک عالم بیخودی طاری رہتا تھا۔ ایک دن قوال یہ شعر پڑھ رہے تھے۔

Marfat.com

کشتگانِ خنجر تسلیم را ! ہر زماں از غیب جانے دیگراست

اس پر آپکی حالت ایسی غیر ہوئی کہ اسی عالم میں روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی آپ کا مزار بابا فریدؒ نے خود اپنے سر پر مٹی لاکر تیار کیا۔ ۱۲۵۲ھ میں مزار کے گرد صندلی کٹہرہ بہادر شاہ ظفر نے بنوایا ۱۳۶۱ھ میں حیدرآباد دکن کے نواب خورشید جاہ نے سنگ مرمر کا کٹہرہ بنوایا۔ ۱۹۴۷ء کے فسادات کیبعد اپنے قتل سے تین دن پہلے مسٹر گاندھی یہاں آئے تو اسکی دوبارہ مرمت کا حکم دیا۔ اور ۱۹۵۰ء میں انکی ہی وصیت کے مطابق پنڈت جواہر لعل نہرو نے مزار کے گرد سنگِ مرمر کا نیا کٹہرا بنوایا۔

میں جس وقت مزار پر فاتحہ پڑھ رہا تھا تو دِل میں یہ سوچ رہا تھا کہ ان بزرگ سے اہل دلّی کو کتنی عقیدت تھی کہ جب انکے مرشد حضرت خواجہ غریب نواز انہیں اپنے ساتھ اجمیر لے جانے لگے تھے تو انہوں نے روتے روتے بُرا حال کرلیا تھا اور یہ کیفیت دیکھ کر خواجہ غریب نواز انہیں دلّی میں چھوڑنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ آج بھی انکی مرجعیت کا یہ عالم ہے کہ صدیاں گذرنے کے باوجود ہر وقت زائرین کی آمد کا سلسلہ جاری ہے۔

حضرت بختیار کاکی کے یارِ غار قاضی حمید الدین ناگوری :

حضرت خواجہ قطب الدّین کاکیؒ کے مزار کے سامنے ذرا بلندی پر ایک مسقف عمارت میں قاضی حمید الدین ناگوری کا مزار ہے جو آپکے یار غار اور معتقدِ خاص تھے۔ لیکن یہاں مزار پر جو کتبہ لگا ہوا ہے اس پر آپ کو حضرت بختیار کاکیؒ کا خلیفہ اور استاد لکھا ہے۔ یہ روایت صرف سیر الاقطاب میں ہے۔ جو محلِ نظر ہے۔ حالانکہ حضرت قطب الدّین نے اپنے ملفوظات فوائد السالکین میں حضرت حمید الدین ناگوری کو صرف اپنا یار غار لکھا ہے اور بس۔ ان کے مزار پر فاتحہ پڑھ کر میں حضرت مولانا خواجہ فخر الدین فخر جہاں دہلوی رحمتہ اللہ علیہ کے مزار پر حاضر ہوا۔ یہ حضرت شاہ ولی اللہ کے ہم عصر اور زبردست عالم و فاضل ہونے کے علاوہ

Marfat.com

عظیم روحانی شخصیت کے بھی حامل تھے۔ آپ نے حضرت خواجہ حسن بصری کے متعلق حضرت شاہ ولی اللہ کے رد میں بڑی معرکتہ الآراء کتاب فخرالحسن لکھی تھی۔ قبلۂ عالم خواجہ نور محمد مہاروی ؒ آپ کے مرید و خلیفہ تھے۔ آپ کے مزار پر یہ قطعہ تاریخ کندہ ہے۔

بگذشت فخر دین چوں مہماں سرائے فانی
برآستانہ جاداد آں قطب جاودانی
سال وصال آں ماہ از غیب چوں بجستم
تاریخ گفت ہاتف خورشید جاودانی

قطب مینار اور مسجد قوت اسلام :

واپس آنے لگا تو بازار میں ایک دو دکانوں پر سرائیکی بولنے والوں کی آواز سنائی دی۔ چونکہ پاکستان میں میرا تعلق بھی سرائیکی بولنے والے علاقہ (بہاولپور) سے ہے۔ اسلئے قدرتی طور پر وہ میرے لئے کشش کا باعث تھے۔ چنانچہ میں نے وہاں رُک کر اُن سے بات چیت کی تو معلوم ہوا کہ وہ ڈیرہ غازیخاں کے رہنے والے ہیں، وہاں میں نے سکوائش کا ایک گلاس پیا اور پھر قطب مینار کی طرف نکل گیا۔ یہاں تماشبیوں کا کافی مجمع تھا۔ اور کھانے پینے کی اشیاء بیچنے والے بھی جگہ جگہ کھڑے تھے۔ پچھلے دنوں قطب مینار کی سیڑھیوں میں جو حادثہ ہوا تھا، اسکی وجہ سے یہ اب بند کردی گئی ہیں۔ یہ مینار مسلم فن تعمیر کا بہترین نمونہ ہے اور دنیا کے عجائبات میں شمار ہوتا ہے۔ اس کو ایک لحاظ سے پیرس کا ایفل ٹاور کہنا چاہیے۔ یہاں سلطان شمس الدین التمش نے مسجد قوتِ اسلام کی تعمیر کا منصوبہ بنایا تھا۔ اس قسم کا ایک مینار اور بننا تھا جو ادھورا رہ گیا۔ اور مسجد کی تعمیر بھی مکمّل نہ ہوسکی۔ قطب مینار کے پاس اور مجوزہ مسجد کے بیچوں بیچ ایک لوہے کی لاٹھ ہے۔ جو لمبائی میں تقریباً

Marfat.com

۴۷ ۲ فٹ ہے۔ اور اسکی موٹائی ۱۶ ۱٫ انچ زیادہ ہے۔ کہتے ہیں کہ یہاں پرانے زمانے میں ایک بہت بڑا مندر تھا۔ مسجد قوت اسلام کے شمال مغربی کونے میں سلطان شمس الدین التمش کا مقبرہ ہے جسکی اندرونی دیواروں پر قرآنی آیات کندہ ہیں۔ میں قطب مینار اور یہاں کے کھنڈرات دیکھ رہا تھا کہ استاذی حضرت حیدر دہلوی کی رباعی یاد آئی۔

تو وہ ہے مسلمان نہ تیرا نام ہے آج
رسوائی اسلاف خوش انجام ہے آج
یہ قطب کی مینار کبھی تھی مینار
انگشت نما قوتِ اسلام ہے آج

قطب مینار کے جنوب مشرق میں تقریباً چالیس قدم پر مسجد قوت الاسلام کا دروازہ ہے جو سرخ پتھر کا ہے اور کافی کشادہ ہے۔ یہاں سے چند گز کے فاصلے پر ایک اور مقبرہ ہے جو امام ضامن کا مقبرہ کہلاتا ہے۔

تغلق آباد اب بھی آباد ھے:

میں نے سوچا کہ قطب صاحب آیا ہوں تو لگے ہاتھوں تغلق آباد بھی دیکھ آؤں جسے کبھی سلطان محمد تغلق نے آباد کیا تھا۔ اور دہلی والوں کو بالجبر وہاں منتقل کرنے کی کوشش کی تھی۔ محمد تغلق سے پہلے غیاث الدین تغلق ہندوستان کا بادشاہ تھا جو حضرت محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیا کا مخالف ہوگیا تھا۔ اور اس نے بنگالہ کی مہم سے واپسی پر آپ کو کہلا بھیجا تھا کہ اس کے آنے سے پہلے وہ دہلی سے کہیں باہر چلے جائیں۔ اس حکم شاہی سے ان کے معتقدین و متوسلین سخت پریشان تھے۔ لیکن حضرت محبوب الٰہی پر اس کا کوئی اثر نہ تھا۔ جب بھی کوئی انکی خدمت میں آکر عرض کرتا کہ دہلی پہنچا ہی چاہتا ہے تو آپ انتہائی بے پروائی سے فرمادیتے

Marfat.com

" ہنوز دلی دور است " غیاث الدین تغلق نے تغلق آباد میں ہی اپنی رہائش کیلئے نیا نیا ایک محل تعمیر کرایا تھا۔ لہٰذا بنگالہ سے واپسی پر وہیں اُسکے قیام کا ارادہ تھا لیکن جونہی وہ اس نو تعمیر محل میں داخل ہوا تو محل کا دروازہ اسکے سر پر آگرا اور وہیں ہلاک ہو گیا اس طرح جو اپنے عتاب کا نشانہ حضرت محبوب الٰہی کو بنانا چاہتا تھا خود عتاب الٰہی کی زد میں آگیا اور آپ جہاں بیٹھے تھے وہیں بیٹھے رہے۔ تغلق آباد کھنڈرات کا ایک عبرت آموز مرقع ہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد اُسے دوبارہ آباد کیا گیا ہے اور یہاں بے شمار عمارتیں بھی تعمیر کیگئی ہیں لیکن تغلق آباد کے قلعے کے آثار اور غیاث الدین تغلق کا مقبرہ اپنے انجام پر آنسو بہاتے دکھائی دیتے ہیں۔

یہاں سے تھوڑے فاصلے پر سورج کنڈ ہے جسے ۶۸۶ قبل از مسیح میں راجہ سورج مل نے تعمیر کرایا تھا۔ یہ تقریباً ۶۔ ایکڑ رقبے پر پھیلا ہوا ہے اور اسکی گہرائی سو فٹ سے زیادہ ہے۔ کسی زمانے میں شاہی خاندان کے افراد سیر و تفریح کیلئے یہاں آتے تھے لیکن اب یہاں بھی ویرانیوں کا ڈیرہ ہے۔ یہیں سورج دیوتا کے ایک مندر کے آثار بھی ہیں۔

میں ان سب پر نظر ڈالتا ہوا اپنے مستقر پر نظام الدین میں آگیا۔ راستے میں وہ انٹرنیشنل سٹیڈیم بھی دیکھا جہاں ایشین گیمز کیلئے ایک نئی بستی بنائی گئی تھی واپس آکر اپنے میزبان علامہ اخلاق صاحب سے آثار قدیمہ کے متعلق گفتگو کرتا رہا۔ انہوں نے دریافت کیا صفدر جنگ نہیں گئے۔ میں نے کہا کل حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلوی کے ہاں حاضری دوں گا۔ تو صفدر جنگ بھی دیکھ آؤں گا چنانچہ اگلے دن میں پہلے صفدر جنگ گیا جو اٹھارویں صدی عیسوی میں تعمیر ہوا تھا اور مغل فن تعمیر کا بہت اچھا نمونہ ہے۔ صفدر جنگ ایک مغل امیر تھا۔ صفدر جنگ سے میں نے چراغ دہلی کا رُخ کیا۔ بمبئی کے ایک دوست سعید صاحب جو ماہر پلینیٹ

Marfat.com

ہیں میرے ہمراہ تھے۔ ان سے حضرت نظام الدین کی بستی میں ہی ملاقات ہوگئی تھی۔ یہ بہت اچھے ساتھی ثابت ہوئے۔ دورانِ سیاحت کسی قسم کا خرچ وہ مجھ کو نہیں کرنے دیتے تھے۔ یہاں تک کہ بس کا کرایہ اور چائے پانی کا خرچ بھی وہ خود کرتے تھے۔ بزرگانِ دین سے انہیں بھی عقیدت ہے چراغ دہلی مختصر سی آبادی کی بستی ہے اور یہاں شہریت سے زیادہ دیہاتی زندگی کا انداز نظر آتا ہے۔ حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی کی درگاہ گلیوں میں گھر گئی ہے۔ ہم پوچھتے پچھلتے وہاں حاضر ہوئے۔

بائیس خواجہ کی چوکھٹ کی حقیقت :

یہ اس شیخ طریقت کی آخری آرام گاہ ہے جس پر خواجگی کا باب ختم ہوا۔ آپ حضرت محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیا رحؒ کے مرید و جانشین تھے۔ اپنے مرشد سے جو تبرکات آپکو ملے تھے وہ آپکی اپنی وصیت کے مطابق آپ کے ساتھ ہی قبر میں دفن کر دیے گئے۔ دلی کو بائیس خواجہ کی چوکھٹ جو کہا جاتا ہے اسکی اصلیت یہ ہے کہ "خواجگی کی نعمت اصولاً مشائخ کرام میں اُن عطیات کے ساتھ وابستہ تھی جو شبِ معراج میں حضور ذاتِ باری سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کئے گئے تھے اور جن میں مشہور نعمت خرقۂ معراجیہ تھا جسکی روایت کتب تصوف اور بزرگوں کے ملفوظات میں بکثرت موجود ہے۔ اس وجہ سے ان حضرات نے پہلا خواجہ اس ذاتِ باری تعالیٰ کو گردانا ہے جس نے شبِ معراج میں اپنے محبوب کو وہ خرقہ امانت عطا فرمایا۔ دوسرے خواجہ محبوب لم یزل یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جنہوں نے اس خرقۂ پاک کو قبول فرمایا تیسرے خواجہ مولائے کائنات حضرت علی کرم اللہ وجہہ ہیں جن کو سرکار دو جہاں نے بعد انتخاب وہ خرقہ اور دیگر تمام نعمتیں عطا فرمائیں۔ حضرت علیؓ کے بعد سے حضرت خواجہ نصیر الدین محمود چراغ دہلی تک ۱۹ خواجگان خاندان چشت جن کو

Marfat.com

وہ تمام معراجی نعمتیں یکے بعد دیگرے تفویض ہوتی رہیں کُل بائیس خواجگان ہو گئے۔ چونکہ حضرت مخدوم چراغ دہلی نے وہ تمام معراجی نعمتیں اپنے ساتھ ہی مزار شریف میں دفن کرلیں اس وقت اصولاً خواجگی حضرت مخدوم پر ختم ہوئی۔ اور چونکہ حضرت مخدوم کا مزار دہلی میں ہے اور حضرت کیساتھ وہ نعمتیں مدفون ہیں جنکی وجہ سے حضرت تک بائیس خواجہ ہوتے ہیں اسلیئے دہلی کو بائیس خواجہ کی چوکھٹ کہا جاتا ہے۔

حضرت خواجہ نصیرالدین چراغ دہلی کو چراغ دہلی اسلئے کہا جاتا ہے کہ یہ حضرت محبوب الٰہی کے ارشاد کے بموجب باؤلی تعمیر کرا رہے تھے اور مزدور چونکہ دن بھر محل شاہی کی تعمیر میں مصروف ہوتے تھے اسلیئے باؤلی کی تعمیر رات کے وقت کرتے تھے بادشاہ کو یہ بات پسند نہیں تھی اسلیئے اس نے اور تو کچھ نہیں کیا البتہ شہر میں یہ حکم بھجوادیا کہ کوئی دکاندار تیل فروخت نہ کرے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ جب تیل نہ ہوگا تو دیئے نہ جل سکیں گے اور اسطرح رات کے وقت مزدور بھی کام کرنے سے معذور ہونگے خواجہ نصیرالدین نے جب اس صورتِ حالات سے حضرت محبوب الٰہی کو مطلع کیا تو انھوں نے فرمایا کہ دیئوں میں تیل کی جگہ پانی استعمال کیا جائے چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ اور خدا کی قدرت سے پانی سے بھی دیئے روشن ہو گئے۔ اور اسطرح تعمیر کا سلسلہ جاری رہا۔ اس واقعہ کے بعد حضرت خواجہ نصیرالدین کا لقب چراغِ دہلی مشہور ہو گیا۔ بعض تذکروں میں اسکی وجہ تسمیہ یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ ایک مرتبہ شیخ مکی امام عبداللہ یافعی نے حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت سے۔ جو حضرت خواجہ نصیر الدین کے مرید و خلیفہ تھے یہ فرمایا کہ اگرچہ شہر دہلی کے بڑے بڑے مشائخ اُٹھ گئے تاہم ان کی برکت کا اثر شیخ نصیرالدین محمود کے اندر موجود ہے۔ ان کی ذات بابرکات بہت غنیمت ہے وہ چراغ دہلی ہیں اور مشائخ کی رسموں کو زندہ کرنے والے ہیں۔ گویا امام عبداللہ یافعی کے اس فرمان کے بعد حضرت خواجہ

Marfat.com

نصیر الدین محمود کا لقب چراغ دہلی ہو گیا۔

حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی کے مزار پر فاتحہ پڑھ کر خواجہ کمال الدین کے مزار پر حاضر ہوا۔ یہ بہت بڑے عالم اور حضرت چراغ دہلی کے مرید و خلیفہ تھے ابو ظفر سلطان فیروز شاہ آپ کا بڑا عقیدت مند تھا حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت نے شرح مشارق آپ سے سبقاً پڑھی تھی حضرت محبوب الٰہی کی بھی آپ پر نظرِ عنایت تھی۔ میں یہاں کھڑا سوچ رہا تھا کہ آہ جس کے علم و فضل سے ایک دنیا مستفیض ہوئی ہے آج بہت سوں کو اُن کے مزار کا بھی علم نہیں۔

مقبرہ ھمایوں، تاج محل کا ہی نقش اوّل ھے:

چراغ دہلی سے واپس آکر شام کے وقت میں نے مقبرہ ہمایوں کا رُخ کیا۔ یہ لبستی حضرت نظام الدین کے مشرق میں تھوڑے ہی فاصلے پر ہے ہندوستان میں مغل طرزِ تعمیر کا اسے پہلا نمونہ کہنا چاہیے آگرے کا تاج محل اِس کا نقشِ ثانی ہے جس میں شاہ جہاں کی محبت کی حسن کاری و جلوہ نمائی ہے تاہم مقبرہ ہمایوں کی عظمت و زیبائش بھی دیکھنے کے قابل ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد ۸۰ سالہ بوڑھے بادشاہ بہادر شاہ ظفر نے لال قلعہ سے نکل کر یہیں پناہ لی تھی۔ پھر ۱۹۴۷ء میں جب مذہبی جنون نے دلی کے مسلمانوں کو اپنے گھروں سے بے گھر کیا تھا۔ تو پرانے قلعے کے علاوہ ہمایوں کے مقبرے نے بھی انہیں اپنی پناہ میں لے لیا تھا۔ مقبرہ ہمایوں کے داہنی جانب ایک وسیع و عریض مسجد ہے جو عیسیٰ خاں کی بنائی ہوئی ہے جو شیر شاہ کے عمائدین میں سے تھا مجھے بتایا گیا کہ اس مسجد کو آباد کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور امید ہے آئندہ جمعہ کی نماز بھی یہاں ہونے لگے گی۔

حضرت محبوب الٰھی کی رھائش گاہ: مقبرہ ہمایوں کی فصیل کے

Marfat.com

کے ساتھ ایک سہ منزلہ عمارت ہے جو مولانا ضیاء الدین وکیل عماد الملک نے حضرت محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیاؒ کی رہائش گاہ کیلئے تعمیر کرائی تھی۔ عمارت کے نچلے حصے میں دو کوٹھڑیاں ہیں جہاں حضرت کے مرید عبادت کیا کرتے تھے۔ دوسری منزل حضرت کے بیٹھنے اور مجالس منعقد کرنے کیلئے مخصوص تھی تیسری منزل میں حضرت کی عبادت اور آرام کا حجرہ تھا۔ اس عمارت سے کچھ فاصلے پر کبھی جمنا بہتی تھی اسے دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ شاید یہیں بیٹھے ہوئے حضرت محبوب الٰہی نے جمنا میں اشنان کرتے ہوئے ہندوؤں کو دیکھ کر حضرت امیر خسرو کے سامنے یہ مصرعہ کہا ہوگا۔ ع

ہر قوم راست رہے دینے وقبلہ گاہے

اور امیر خسرو نے حضرت کی طرف اشارہ کر کے جن کی کلاہ سر پر قدرے ترچھی رکھی ہوئی تھی برجستہ یہ دوسرا مصرعہ کہا ہوگا۔

من قبلہ راست کردم بر سمت کج کلاہے

آہ کیا وہ زمانہ تھا خوش قسمت تھے وہ لوگ جنہوں نے ان بزرگوں کی صحبت پائی۔

رات نے اپنی زلفیں فضا میں پھیلانی شروع کر دی تھیں اسلئے اگلے وقتوں کا تصور کئے اپنے مستقر پر واپس آ گیا۔

قیصر حیدری بھی اُستاد بن گئے:

دوسرے دن میں نے عزیزی قیصر حیدری کا پتہ معلوم کیا۔ یہ استاذی حیدر دہلوی کے بھانجے ہیں بچپن میں ترنم سے بہت اچھا پڑھتے تھے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد اُن سے ملنا نہیں ہوا تھا۔ سنا تھا کہ وہ اب استاد بن گئے ہیں۔ مجھے ان سے ملنے کا اشتیاق تھا۔ کسی نے بتایا کہ رات کے وقت تو ان کی نشست بازار چتلی قبر میں کریم ہوٹل پر ہوتی ہے البتہ رہائش

Marfat.com

بلی ماران کے ایک پریس میں ہے چنانچہ میں جامع مسجد پہنچ کر ایک سائیکل رکشہ میں چاوڑی بازار، حوض قاضی اور لال کنویں سے ہوتا ہوا ہمدرد دواخانہ کے سامنے بلی ماران کے نکڑ پر اتر گیا۔ یہاں تک کا کرایہ رکشہ والے نے صرف ایک روپیہ لیا میں نے دیکھا کہ دہلی میں مسلمان زیادہ تر مزدور پیشہ ہیں سائیکل رکشہ بھی عموماً وہی چلاتے ہیں۔ دیکھنے میں مسلمانوں پر اقتصادی خوشحالی کے آثار نظر نہیں آتے لیکن کسی نہ کسی دھندے سے سب لگے ہوئے ہیں۔ کام پیشہ لوگوں کی اکثریت ہے یا چھوٹی موٹی دکانیں گلی کوچوں میں لگائی ہوئی ہیں۔ دلی کی رکشائیں پاکستان میں چلنے والی رکشاؤں سے تو کشادہ ہیں لیکن ان پر بیٹھیں تو ایسا لگتا ہے کہ کسی پھسل پنڈے پر بیٹھے ہیں۔ لال کنویں سے گزرا تو اخبار انجام اور اخبار جنگ کے دفتر بھی دیکھے جہاں اب کچھ اور کاروبار ہوتا ہے۔ بلی ماران داخل ہوتے ہی چند قدم کے فاصلے پر اس پریس کا بورڈ نظر آیا جہاں قیصر حیدری رہتے ہیں۔ اندر داخل ہوا تو پریس کی عمارت کے ایک کونے میں ایک نشست گاہ پر کوئی بڑے میاں بیٹھے نظر آئے جنکی داڑھی بھی سفید تھی اور لمبی لمبی زلفیں بھی کندھوں پر بکھری ہوئی تھیں۔ میں نے اِن سے قیصر کے متعلق پوچھا تو وہ بولے میں حاضر ہوں۔ گویا یہی قیصر حیدری تھے۔ میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ ۱۹۴۷ء میں جس لڑکے کو دہلی میں چھوڑ گیا تھا وہ اب اتنا بوڑھا ہو گیا ہو گا۔ میں خاموشی سے اُن کے قریب بچھی ہوئی ایک کرسی پر بیٹھ گیا کچھ دیر وہ مجھے گھورتے رہے اور پھر ایکدم پہچان کر مجھ سے لپٹ گئے۔ اور دیر تک فرطِ محبت سے اشک فشاں رہے۔ میرا بھی دل بھر آیا۔ انہیں یوں میرے دہلی آنے پر تعجب بھی تھا اور خوشی بھی۔ انہوں نے فوراً میرے لئے چائے منگائی اور ماضی و حال کے قصے سناتے رہے۔

تھوڑی دیر بعد ان کے شاگرد عزیز مخدوم زادہ ممتاز عثمانی آ گئے۔ یہ پانی پت

Marfat.com

کے مخدوم زادوں میں سے ہیں۔ بڑے نستعلیق نوجوان ہیں۔ انہوں نے اپنے استاد کی سرپرستی میں میر کلچرل سوسائٹی قائم کی ہوئی ہے اور "شہر میر" کے نام سے ایک اخبار بھی نکالتے ہیں جسکی ادارت کی ذمہ داری نیر حیدری پر ہے۔ یہاں باتوں میں دو بج گئے تھے اور چائے کے کئی دور چل چکے تھے کہ میں نے دیکھا عثمانی صاحب اچانک وہاں سے غائب ہو گئے ہیں لیکن تھوڑی دیر بعد دیکھا تو وہ کھانے کا بہت سا سامان لئے چلے آرہے ہیں۔ میں نے اس پھرتی پر تعجب کا اظہار کیا تو کہنے لگے کھانے کا وقت ہو گیا ہے "کچھ تناول فرمالیں" میرے یہ کہنے کے باوجود کہ میں صبح ناشتے میں اتنا کھا لیتا ہوں کہ دوپہر کے کھانے کی ضرورت نہیں رہتی انہوں نے زبردستی مجھے کھانا کھلایا کھانے کے بعد میں نے دہلی کی کچھ پرانی ادبی شخصیتوں کے متعلق دریافت کیا تو پتہ چلا کہ بہت سے تو اب اس دنیا میں نہیں ہو نگے پھچھے ہیں وہ بھی چراغ سحری ہیں۔ میں نے کہا کہ کیا ہی اچھا ہو کہ ان سے ملاقات ہو جائے اس سلسلے میں عثمانی صاحب نے رضا کارانہ طور پر اپنی خدمات پیش کیں اور کہا کہ وہ کل صبح میرے پاس نظام الدین آئیں گے اور پھر جہاں جہاں میں جانا چاہوں گا وہ مجھے لے چلیں گے۔

آتش بہاولپوری دہلی میں:

دوران گفتگو نیر حیدری صاحب نے بتایا کہ کئی دن ہوئے بہاولپور کے دہلی دیال آتش میرا خط لیکر ان کے پاس آئے تھے۔ اور کہہ رہے تھے کہ آپکی مطلوبہ معلومات فراہم کر کے مجھے خط کا جواب لکھیں گے۔ دیوی دیال آتش نے ۱۹۴۷ء میں بہاولپور سے ترک سکونت کی تھی اور اب سونی پت سے پیغام کے نام سے ایک ہفت روزہ اخبار نکالتے ہیں۔ میں نے انہیں اپنی زیر تصنیف کتاب "بہاولپور میں اردو" کے سلسلے میں بعض غیر مسلم شعراء

Marfat.com

ادبا کے متعلق کچھ معلومات حاصل کرنے کیلئے لکھا تھا جب مجھے معلوم ہوا کہ آتش بہاولپوری اپنے اخبار کی طباعت کے سلسلے میں یہاں آتے رہتے ہیں تو میں نے قیصر سے کہا کہ وہ آئیں تو انکو میرے متعلق بتا دینا۔ ان سے میں ضرور ملوں گا قیصر نے بتایا کہ وہ شاید پرسوں آئیں اگر میں بھی گیارہ بجے تک آجاؤں تو ان سے ضرور ملاقات ہو جائیگی بہر حال میں انہیں روک کے رکھوں گا۔

شام ہو چلی تھی اسلئے میں اگلے دن کیلئے عثمانی صاحب کو نظام الدین کا پابند کر کے وہاں سے رخصت ہو گیا۔ رات کو علامہ صاحب سے ملنے رضا صاحب لال محل میں آگئے۔ یہ کویت ایجنسی میں فرسٹ سیکرٹری ہیں اور رام پور کے علمی گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں، انہیں علوم اسلامی بالخصوص قرآن و حدیث سے خاص شغف ہے۔ بہت دیر تک ان سے علمی گفتگو ہوتی رہی۔

اہل دہلی سے ملاقاتیں:

دوسرے دن ابھی میں ناشتے سے فارغ ہوا تھا کہ حسب وعدہ مختار عثمانی مجھے لینے آگئے۔ میں نے جلدی جلدی کپڑے تبدیل کئے اور ان کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ سب سے پہلے گوپی ناتھ امن لکھنوی سے ملنے دریا گنج گیا۔ امن صاحب ۱۹۴۷ء سے پہلے دہلی کے ایڈیٹر تھے اور اپنی صلح کل طبیعت کی وجہ سے ہندو مسلم حلقوں میں مساوی مقبول تھے۔ بڑے اچھے شاعر ہیں، نعتیں سلام اور منقبتیں بھی بہت اچھی کہتے ہیں، محرم کے جلوس میں ان کا سلام پڑھنا آج تک مجھے یاد ہے۔ الہام دہلی کے قلمی معاونین میں سے تھے۔ اکثر ان کے رشحات قلم سے الہام مزین ہوتا تھا۔ آزادی کے دہلی کی وزارت اطلاعات انہیں سونپ دی گئی تھی۔ سنا تھا کہ آج کل وہ مفلوج ہیں اور چلنا پھرنا ترک ہو گیا ہے۔ میں عثمانی صاحب کے ساتھ ان کے ہاں پہنچا تو وہ پہیوں والی کرسی پر بیٹھے ایک صاحب کیساتھ شطرنج

Marfat.com

کھیل رہے تھے عثمانی صاحب نے میرے متعلق بتایا تو وہ فوراً پہچان گئے اور کہنے لگے کہ میں صرف ٹانگوں سے معذور ہوں۔ باقی اعضا ٹھیک ہیں۔ ان کی عمر ۸۰ سال سے کم نہ ہوگی۔ لیکن میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ انہیں ۲۵ سال پہلے کی باتیں اس طرح یاد تھیں جیسے یہ کل کی بات ہے۔ انہیں یہ بھی یاد تھا کہ الہام میں انکے کون کون سے مضامین اور نظمیں چھپی تھیں۔ وہ کافی دیر تک پرانے قصے سناتے رہے اور پاکستان کی ادبی وصحافتی سرگرمیوں کے متعلق پوچھتے رہے۔ انہوں نے چائے سے میری تواضع کی اور چلتے وقت مجھے اپنا مجموعۂ کلام" کاروان منزل کا ایک نسخہ بھی اپنے دستخط کر کے عنایت کیا۔

یہاں سے ہم کنور مہندر سنگھ بیدی سحر سے ملنے گئے۔ یہ ترکمان دروازے کے باہر ایک فرم کے دفتر میں بیٹھا کرتے ہیں۔ ہم دریا گنج سے اُن سے دفتر تک پیدل ہی گئے۔ ترکمان دروازے کے باہر کبھی سناٹا ہوتا تھا اب بے شمار عمارتیں بن چکی ہیں جن میں کاروباری دفتر بھی ہیں۔ بیدی صاحب کے دفتر پہنچے تو اُن کے چپڑاسی نے بتایا کہ وہ بلڈنگ کی دوسری جانب کار میں بیٹھ کر ابھی کہیں جانے والے ہیں چنانچہ ہم نے وہیں جا کر اُن سے ملاقات کی۔ وہ کسی ضروری کام سے اپنے کچھ مہمانوں کے ساتھ جا رہے تھے لہذا انہوں نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ اگر کل کسی وقت تشریف لائیں تو بہت خوشی ہوگی اور باتیں بھی ہونگی۔ بیدی صاحب تقسیم کے وقت دہلی کے ڈپٹی کمشنر تھے۔ یہ باباگرونانک کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ شاعر وشاعرنواز اور زندہ دل انسانوں میں سے ہیں۔ افسوس ہے میں دوبارہ تو اُن کے پاس نہیں جا سکا۔ البتہ بعض ادبی محفلوں میں اُن سے دو ایک بار ملنا ہوگیا۔ ویسے بھی چونکہ مجھے ان سے ہم مشربی کا شرف حاصل نہیں اس لئے انکی نجی محفلوں کی رنگینیوں سے محروم رہا۔

Marfat.com

کنور مہندی سنگھ بیدی کے دفتر سے چل کر ہم شمع دہلی کے دفتر پہنچے۔ یہ دفتر بھی ترکمان دروازے سے کچھ دور اور اجمیری دروازے کے قریب ہے۔ شمع کے مالک و مدیر حافظ محمد یوسف میرے ہمعصر ہیں۔ الہام بھی اسی زمانے میں نکلنا شروع ہوا تھا جب شمع نکلا تھا۔ شمع پہلے حافظ محمد یوسف صاحب کے بڑے بھائی نکالتے تھے جو خود بھی بڑے اچھے افسانہ نگار تھے۔ ان کے انتقال کے بعد یوسف صاحب نے اسے سنبھال لیا۔ تقسیم سے پہلے بھی یہ اردو کا سب سے مقبول فلمی رسالہ تھا اور اب بھی صفِ اوّل کے جرائد میں اسکا شمار ہوتا ہے۔ شمع کے ساتھ اب انہوں نے کئی اور بھی اردو اور ہندی پرچے نکال رکھے ہیں اور بڑے وسیع پیمانے پر ان کا اشاعتی کاروبار ہے۔ اُن کا دفتر ایک وسیع ہال میں ہے جس کے گرد ایڈیٹروں اور مینجروں کے علیحدہ علیحدہ کمرے ہیں۔ باقی اہلکار ہال کے بیچوں بیچ بیٹھتے ہیں جو تعداد میں بیس پچیس سے کم نہ ہونگے۔ ہال میں داخل ہونے سے پہلے ایک دفتر استقبالیہ ہے جہاں ایک خاتون بیٹھتی ہیں۔ ہمارا سابقہ سب سے پہلے انُ سے پڑا۔ ان سے حافظ یوسف صاحب سے ملنے کیلئے کہا تو انہوں نے بتایا کہ وہ بمبئی گئے ہوئے ہیں۔ البتہ انکے چھوٹے صاحبزادے ہیں اگر میں چاہوں تو انُ سے ملاقات کرسکتا ہوں۔ میں نے کہا جب یہاں آیا ہوں تو ان سے ہی مل لوں گا۔ وہ محترمہ ایک چٹ پر میرا نام لکھنے لگیں تو میں نے دیکھا کہ یہ ہندی زبان میں تھا۔ مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے کہہ ہی دیا کہ شمع کے دفتر میں استقبال کنندہ کو کم از کم نام وغیرہ تو اردو میں لکھنا آنا چاہیئے۔ وہ مسکرا کر رہ گئیں۔ انہوں نے ٹیلیفون پر میرے متعلق بتایا تو حافظ یوسف کے صاحبزادے نے فوراً مجھے بلوا لیا۔ وہ بڑے تپاک سے ملے۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے وہ بہت چھوٹے ہوں گے۔ اسلئے وہ مجھے پہچان تو نہ سکے لیکن

Marfat.com

اپنے والد کا ملنے والا سمجھ کر میری آؤ بھگت کرتے رہے۔ انہوں نے بتایا کہ حافظ صاحب تین چار دن تک واپس آجائیں گے۔ ان کے آنے پر میں ضرور دوبارہ آؤں لیکن افسوس ہے کہ دوسری مصروفیات کی وجہ سے دوبارہ وہاں نہ جا سکا اور حافظ یوسف صاحب سے نہ ملنے کا ملال ہی رہا۔

سنگم کے دفتر سے چل کر ہم اجمیری دروازے کے پاس آئے۔ یہاں پہلے عربک کالج کی عمارت دور سے نظر آتی تھی لیکن اب دوسری عمارتوں میں چھپ گئی ہے یہاں سے ہم محلہ شاہ گنج، گلی شاہ تارا اور محلہ نیاران میں ہوتے ہوئے کوچہ پنڈت تک گئے۔ اس علاقے میں میرے کئی عزیزوں کے مکان تھے۔ یہیں خان بہادر ڈپٹی بہاؤالدین جو میرے نانا ہوتے تھے رہا کرتے تھے۔ یہیں ڈپٹی عزیزالدین داروغہ عبدالعزیز اور خواجہ حامد حسن کے مکانات تھے۔ محلہ نیاریاں میں میری نانی رہا کرتی تھیں۔ یہ ویسا کا ویسا تھا فرق تھا تو یہ کہ پہلے اس مکان کے زیر دیوار کہاروں کی ڈولیاں رکھی ہوتی تھیں جن کا اب نام و نشان نہ تھا۔ ۱۹۴۷ء سے قبل دہلی کی پردہ نشین خواتین ایک جگہ سے دوسری جگہ ان میں بیٹھ کر جایا کرتی تھیں۔ اب یہ متروک ہو گئی ہیں۔ شاید آزادی کے بعد کہاروں نے جو عموماً ہندو ہوا کرتے تھے مسلمان عورتوں کا بوجھ اٹھانا باعثِ ذلت سمجھتے ہوئے اس کاروبار کو ترک کر دیا ہے۔ نیاریوں کی مسجد اپنی والدہ کے چچا سید صغیر حسن کا نام لکھا ہوا دیکھا تو مجھے خوشی ہوئی کہ اہلِ محلہ نے ان کے پاکستان منتقل ہونے کے باوجود ان کی خدمات کو فراموش نہیں کیا۔

یاراں فراموش کردند عشق:

محلہ شاہ گنج، شاہ تارا اور محلہ نیاریان کے مغربی جانب باہر کی طرف گرانڈ بسٹن روڈ تھی جہاں چاوڑی بازار سے طوائفوں کو اٹھا

Marfat.com

آباد کر دیا گیا تھا۔ ان طوائفوں کی وجہ سے سڑک پر بڑی رونق ہوتی تھی لیکن اب معلوم ہوتا ہے اہلِ دِلی کو اس بازار سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ شاید لوگوں کے اس ذوق نے اب کوئی دوسرا رُخ اختیار کر لیا ہے یا کساد بازاری اور اقتصادی عدم استحکام کیوجہ سے "یاراں فراموش کردند عشق" بہرحال اس بازار کی بے رونقی سے خوشی بھی ہوئی اور افسوس بھی۔ خوشی تو اس بات کی تھی کہ چلو گناہوں کا یہ محرک ختم ہوا لیکن افسوس یہ تھا کہ اس گندے نالے نے بند ہو کر کہیں محلوں اور کوچوں کا رُخ نہ کر لیا ہو۔

عزیز وارثی نے رُلا دیا:

کوچہ پنڈت سے نکل کر ہم بلی ماران کی طرف جا رہے تھے جب ہمدرد دواخانہ کے پاس پہنچے تو مختار عثمانی نے کہا کہ آیئے عزیز وارثی صاحب سے ملتے چلئے۔ یہ ہمدرد دواخانہ میں ہی ہوتے ہیں۔ عزیز وارثی کہنہ مشق اور خوش فکر شاعر ہیں۔ میرے ۱۹۴۷ء سے پہلے کے ملنے والوں میں ہیں۔ شعر گوئی کے علاوہ ہم مذاقی و ہم مسلکی کا بھی ان سے رشتہ ہے۔ یہ میرے استاد مولوی عبدالسّلام نیازی کے نیازمندوں میں سے ہیں۔ ان سے ملکر دل بہت خوش ہوا۔ انہوں نے پرانے دور کی جو باتیں شروع کیں تو اُن کا تصور کر کے میری آنکھیں ساون بھادوں بن گیئں۔ ان کے کلام کے دو مجموعے جسارت اور محراب کے نام سے چھپ کر قبولیت عامہ کی سند حاصل کر چکے ہیں۔ از راہِ محبت یہ دونوں مجموعے اپنے دستخطوں کے ساتھ انہوں نے مجھے بھی عنایت کئے۔

یہاں سے رخصت ہو کر قیصر حیدری کے پاس پہنچا تو آتش بہاولپوری کو اپنا منتظر پایا وہ بڑی محبت سے ملے اور اپنے بہاولپوری احباب کی خیریت دریافت کرتے رہے۔ میں نے دیکھا کہ بہاولپور کے ذکر پر اُنکی آنکھوں میں آنسوؤں

Marfat.com

کے تارے چمک رہے تھے۔ میرے خط کے جواب میں تاخیر پر شرمندہ تھے۔ کہنے لگے کہ وہ میری مطلوبہ معلومات بہت جلد حاصل کر کے مجھے بہاولپور بھیج دیں گے۔ انہوں نے مجھے سونی پت کی دعوت بھی دی اور کہا کہ چند روز تک وہاں میرے اعزاز میں ایک شاندار مشاعرے کا اہتمام کر کے مجھے اطلاع دیں گے۔ ساتھ ہی انہوں نے اپنی تازہ تصنیف "نذرِ اقبال" عطا کی۔ اسمیں علامہ اقبالؒ کے منتخبہ اشعار کی تضمینیں کی گئی ہیں جو انکی علامہ سے خوش عقیدگی کی مظہر ہیں۔

ایک نایاب کتاب مِل گئی:

آج جمعہ تھا اسلئے میں کہیں نہیں گیا۔ نماز جمعہ درگاہ حضرۃ نظام الدینؒ میں پڑھی جہاں کافی خلقت تھی۔ باقی وقت لال محل میں علامہ اخلاق صاحب کے کتب خانے سے استفادہ کرتا رہا۔ علامہ صاحب نے مجھے ایک نادر کتاب "تذکرہ آثار الشعرائے ہنود" دکھائی جو میرے ہی دادا میر حسن رضوی کے مطبع رضوی کی چھپی ہوئی تھی۔ یہ ہندوستان کے ہندو شعراء کا تذکرہ ہے جسے منشی دیبی پرشاد ابشاش خلف منشی نتھن لال بہجت باشندہ قدیم بھوپال نے مرتب کر کے ۱۸۸۵ء میں شائع کرایا تھا۔ اس میں پانچ سو سے زائد ہندو شعراء کے حالات اور اُن کا نمونۂ کلام درج ہے۔ میں نے آج سارا دِن اس کتاب کی ورق گردانی کی۔

نئی دِلی کا گشت:

اگلے روز میں پھر دِلی کا گشت لگانے نکل کھڑا ہوا۔ اب کے میں نے نئی دلی کا رُخ کیا تھا۔ یہاں پہنچ کر سب سے پہلے یہ احساس ہوتا ہے کہ شاید ہم باغوں کے شہر میں آگئے ہیں۔ ہر طرف کھُلے میدان اور فلک بوس عمارتیں نظر آتی ہیں۔ جگہ جگہ سبزہ زار اور پھولوں کے تختے ہیں جن کے بیچوں بیچ پانی کے فوارے لگے ہوئے ہیں۔ اس حسین منظر کو سڑکوں کے ساتھ ساتھ قطار اندر قطار

Marfat.com

درختوں نے اور بھی حسن و رعنائی عطا کر دی ہے۔ کہتے ہیں کہ انیسویں صدی عیسوی تک یہاں کوئی عمارت نہ تھی نہ آبادی کا نام و نشان۔ ہاں کہیں کہیں آثارِ قدیمہ میں سے کوئی ٹوٹی پھوٹی عمارت دکھائی دے جاتی تھی جس سے یہ پتہ چلتا تھا کہ کبھی یہ حصہ بھی آباد ہوگا غالباً ۱۹۱۲ء میں ایک انگریز وائسرائے کو یہ جگہ دیکھ کر خیال آیا تھا کہ یہاں ہندوستان کا نیا دارالحکومت تعمیر ہونا چاہیے چنانچہ اس نے دو انگریز ماہرینِ فنِ تعمیر کی خدمات حاصل کر کے جدید ضرورتوں کے مطابق اس کا نقشہ تعمیر کرایا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ اسکی تعمیر شروع ہوئی۔ پہلے پہل وائسرائیگل لاج سیکرٹریٹ اور سرکاری ملازمین کے بنگلے بنے۔ پھر کناٹ سرکس بنا جو نئی آبادی کے ساتھ ساتھ ایک دائرے کی شکل میں ہے۔ یہ جدید طرز کا شاپنگ سنٹر ہے اب تو زیرِ زمین بھی ایک اور شاپنگ سنٹر تعمیر ہو چکا ہے اور نئی دہلی کی رونق پہلے سے کہیں زیادہ ہے لیکن ۱۹۴۷ء تک یہ تعمیری مراحل سے گذر رہا تھا۔

ترکمان دروازے کے باہر ابھی پوری طرح عمارات تعمیر نہیں ہوئی تھیں۔ ترکمان دروازے کی فصیل اور اسکے ساتھ پرانی آبادی موجود تھی۔ پچھلے دنوں اسی آبادی کو ڈھا کر نئی تعمیرات کا سلسلہ شروع کرنے پر مسز اندرا گاندھی کی حکومت کے خلاف مسلمان اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ ہمارا موروثی مکان بھی ترکمان دروازے کے اندر جا کر محلہ بھوجلا پہاڑی میں ہے۔ غالباً سکیم یہ تھی کہ جامع مسجد کو نئی دہلی سے ملا دیا جائیگا۔ اور درمیان میں جو محلے اور مکانات آتے ہیں، انہیں گرا کر ایک سڑک نکالی جائیگی۔ یہ سکیم تو مسلمانوں کے واویلا سے مکمل نہ ہو سکی تاہم فصیل گرا کر یہاں کچھ نئی عمارات ہو گئی ہیں اور اروِن ہسپتال سے اجمیری گیٹ تک بیشمار تعمیرات کا سلسلہ چلا گیا ہے۔

راشٹرپتی بھون کسی محل سے کم نہیں: وائسریگل لاج جواب

راشٹرپتی بھون کہلاتا ہے اس میں بھارت کے صدر رہتے ہیں۔ یہ عظیم الشان عمارت کسی محل سے کم نہیں۔ اس پر تانبے کا چمکتا ہوا گنبد آنکھوں کو چکا چوند کرتا ہے۔ اس کے اندر دربار ہال، بال روم، ڈائننگ ہال اور پرائیویٹ کمرے ہیں۔ اس پوری عمارت میں ہندو مسلم ثقافت کیساتھ جدید مغربی طرز کا بھی امتزاج ہے۔ اندرونی حصے میں مغلیہ طرز کا ایک خوبصورت باغ ہے جسے موسم سرما میں ایک مہینے کیلئے کھول دیا جاتا ہے تاکہ عوام یہاں کی سیر کرسکیں۔

سیکرٹریٹ کی صرف غلام گردشیں ۸ میل لمبی ہیں:

یہاں اکثر عمارات پر گنبد ہیں جنکی وجہ سے ان کا قدیم تاریخ سے رشتہ بالکل منقطع نہیں ہوا چنانچہ سیکرٹریٹ کی عمارت پر بھی گنبد ہیں جو تقریباً تین سو فٹ بلند ہیں۔ سیکرٹریٹ ایک ہزار کمروں پر مشتمل ہے اور اس میں غلام گردشوں کی لمبائی ۸ میل کے قریب ہے۔ یہ ہندوستان کے دفتری نظام کا سب سے مضبوط قلعہ ہے۔

پارلیمنٹ ہاؤس:

سیکرٹریٹ کے آگے پارلیمنٹ ہاؤس ہے جو دارالسلطنت دہلی کی تمام جدید عمارات میں سب سے زیادہ پُروقار ہے۔ اس میں ستونوں کی مسلسل قطار نے اسکی خوبصورتی اور وقار میں مزید اضافہ کردیا ہے۔ عمارت کے اندر دو الگ الگ حصے ہیں۔ ایک راجیہ سبھا (بالائی ہاؤس) اور دوسرا لوک سبھا (زیریں ہاؤس) کیلئے مخصوص ہے۔

نئی عمارات میں نیشنل سٹیڈیم بھی قابل دید ہے جو غالباً ۱۹۵۱ء میں تعمیر کیا گیا تھا اور اس میں بیک وقت پچاس ہزار تماشائی بیٹھ سکتے ہیں۔

نیشنل اسٹیڈیم کے قریب ایک یادگاری مینار ہے جو جنگِ عظیم اوّل

Marfat.com

میں سترہ ہزار ہندوستانی سپاہیوں کے کام میں آنے کی یاد تازہ کرتا ہے۔ نئی دہلی سے پرانی دہلی کی طرف جاتے ہوئے پارلیمنٹ سٹریٹ آتی ہے۔ یہیں آل انڈیا ریڈیو کا براڈ کاسٹنگ ہاؤس ہے۔

میں نے نئی دہلی کی سیر پیدل چل کر کی تھی اور اب چلتے چلتے اتنا تھک گیا تھا کہ کچھ دیر سستانے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی چنانچہ اسی فکر میں آگے بڑھا تو جنتر منتر نظر آیا۔ یہ قدیم عہد کی رصدگاہ ہے جسے اٹھارہویں صدی عیسوی میں ایک نجومی راجکمار نے تعمیر کرایا تھا۔ اس کے اردگرد گھاس کے وسیع پلاٹ ہیں۔ میں وہیں جاکر بیٹھ گیا اور پاس ہی ایک خوانچہ فروش سے ٹھنڈی ٹھنڈی گاجریں لیکر کھانے لگا۔ کچھ دیر سستانے کیبعد میں وجیا بھون دیکھنے گیا جو جدید طرز کا کانفرنس ہال ہے۔ اس میں ایک سے زیادہ زبانوں میں بیک وقت آوازیں سُنی جا سکتی ہیں۔ یہاں سے مَیں واپس نظام الدین آگیا۔

ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل:

یہاں آج شام کو غالب اکیڈمی میں ڈاکٹر ایس عابد حسین میموریل ٹرسٹ کی طرف سے ہندوستانی مسلمانوں کے تعلیمی و تمدنی مسائل پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر سید حامد کا لیکچر تھا۔ تین بجے سہ پہر یہ جلسہ شروع ہوا۔ مسٹر احمد رشید شیروانی جلسے کے صدر تھے۔ سب سے پہلے پروفیسر مشیر الحق نے ڈاکٹر سید عابد مرحوم کی علمی و سائنسی خدمات پر روشنی ڈالی اور بتایا کہ جس مشن کو انھوں نے زندگی بھر جاری رکھا ہم نے اس کو زندہ رکھنے کیلئے یہ ٹرسٹ بنایا ہے اور یہ امر باعثِ مسرت ہے کہ ٹرسٹ کے ممبران اپنے مقصد کی کامیابی کیلئے برابر سرگرمِ عمل ہیں۔ ان کے لبعد ڈاکٹر نثار احمد فاروقی نے سید حامد وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا تعارف کرایا جو ہندوستان کی مشہور علمی شخصیت ہیں

Marfat.com

سید حامد نے بڑے دلنشیں انداز میں ہندوستانی مسلمانوں کے تعلیمی و تمدنی مسائل پر اظہارِ خیال کیا اور بڑی تفصیل سے مسئلے کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لیا۔ انکی تقریر کا لب لباب یہ تھا کہ اس وقت ہندوستانی مسلمان تعلیم کے میدان میں بہت پیچھے ہیں اور یہی پسماندگی ہر شعبۂ حیات میں انکی ترقی میں رکاوٹ بنی ہوئی ہے۔ انہوں نے مسلمانوں کیلئے تعلیمی وفنی میدان میں ادارے کھولنے کی ضرورت پر زور دیا۔ انہوں نے یہ حقیقت پسندانہ بات بھی کہی کہ اگر مسلمان ہندوستان میں تناسب آبادی کے لحاظ سے اپنے لئے سرکاری ملازمتوں میں اپنا حصہ طلب کرنے کی خواہش رکھتے ہیں تو پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ اس تناسب سے انکی تعلیمی استعداد بھی اس معیار کی ہے کہ وہ ملازمتوں کے حقدار قرار پائیں۔ انہوں نے صنعت وحرفت میں بھی مسلمانوں کو اپنی صلاحیتیں بروئے کار لانے پر زور دیا۔

سید حامد صاحب کی تقریر منطقی اور قطعی غیر جذباتی تھی۔ انہوں نے حقائق و تجزیہ کے ساتھ جو دیبانہ پیرایہ اختیار کیا تھا اُس کا لوگوں پر بڑا خوشگوار اثر معلوم ہوتا تھا۔ ان کی تقریر ختم ہونے پر میں نے بطورِ خاص ایسی عمدہ اور حقیقت پسندانہ تقریر پر اُنہیں مبارکباد پیش کی۔ آخر میں احمد رشید شیروانی صاحب نے بھی صدارتی تقریر کی تھی لیکن اس کا رنگ سیاسی تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی انتخابی جلسے سے خطاب کر رہے ہیں۔ بہرحال ڈاکٹر ایس۔ آر۔ قدوائی نے شرکائے اجلاس اور سید حامد صاحب کا شکریہ ادا کیا اور اس کے ساتھ یہ علمی مجلس برخواست ہوئی۔

میرے میزبان پورے بارہ دن بعد گھر آئے:

آج سارا دن کی مصروفیات نے مجھے تھکا دیا تھا اسلئے رات کا کھانا کھاکر میں جلدی سو گیا۔ رات کے بارہ بجے کے قریب کسی کے باہر سے آنے کی آہٹ ہوئی تو میری آنکھ کھل گئی۔ خواجہ نثار صاحب نے جو خواجہ حسن نظامی

Marfat.com

مرحوم کے داماد ہیں اور لال محل میں سید حسین صاحب کے ساتھ ہی رہتے ہیں۔ اُٹھ کر دروازہ کھولا۔ میں آواز سے تو پہچان گیا کہ یہ حکیم صاحب ہیں لیکن خاموش آنکھیں بند کئے پلنگ پر لیٹا رہا۔ انہوں نے میری طرف اشارہ کر کے خواجہ صاحب سے دریافت کیا کہ یہ کون صاحب ہیں؟ خواجہ صاحب بولے تمہارے مہمان ہیں خود پہچان لو کہ کون ہو سکتے ہیں! انہیں میرے متعلق سان و گمان بھی نہ تھا لیکن جب میں نے لحاف سے منہ نکالا تو وہ فوراً پہچان گئے۔ میں اُٹھ کر بغل گیر ہوا۔ کہنے لگے کب آئے مجھے تو تمہاری آمد کا پتہ ہی نہیں چلا کب سے آئے ہوئے ہو؟ میں نے بتایا کہ آج بارھواں دِن ہے۔ میں تو سمجھا تھا کہ آپ سے ملے بغیر ہی واپس جانا پڑے گا کہنے لگے اب کے لکھنؤ میں غیر معمولی دیر ہو گئی ورنہ تو میں دو چار دِن سے زیادہ باہر نہیں رہتا لیکن اگر تمہارے متعلق مجھے وہاں اطلاع مِل جاتی تو میں فوراً آجاتا خیر سناؤ کیسی صحت ہے؟ چچی چھابو کا کیا حال ہے؟ کافی دیر تک دوسرے عزیز رشتہ داروں کی خیریت دریافت کرتے رہے۔ پھر بولے میاں یہ تو بتاؤ دہلی میں اب تک کہاں کہاں گئے اور کس کس سے ملے؟ میں نے کہا پہلے تو دو تین دِن آپ کے انتظار میں لال محل کے در و دیوار ہی تکتا رہا اور بار بار یہ شعر میری زبان پر آتا تھا۔ ؎

جب تو نہیں اقامت دیر و حرم فضول
اب کیا یہاں پرستش دیوار و در کریں۔

پھر اسی مایوسی کے عالم میں یہاں سے خود باہر نکل کھڑا ہوا۔ گلی گلی کوچے کوچے پھرا۔ سڑکوں کی پیمائش بھی کی۔ ہر طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا رہا کہ شاید کوئی شناسا صورت نظر آجائے لیکن یہاں کا تو آوا باوا آدم ہی نرالا ہے۔ ہر چیز اجنبی لگتی ہے۔ کوئی جان پہچان والا دکھائی نہیں دیتا۔ کہنے لگے ہاں میاں اب دہلی وہ دہلی نہیں رہی۔ تمہارے

Marfat.com

وقت کے اکثر لوگ تو پاکستان چلے گئے۔ جو بچ گئے تھے انہیں قضا لے گئی۔ نئی پود کو نہ تم جانتے ہو اور نہ وہ تمہیں پہچانتے ہیں۔ میں نے کہا اور تو تقریباً سب جگہ حاضری دے چکا ہوں البتہ قدم شریف اور خواجہ باقی باللہ ابھی تک نہیں گیا۔ کہنے لگے کہ اچھا کل ہی وہاں چلیں گے۔ اور کچھ دلّی والوں سے بھی جو اکا دکا رہ گئے ہیں تمہیں ملوائیں گے۔

دائرہ اسلام سے نکلے ہوئے ہزاروں مسلمان پھر اسلام کے دائرے میں آ گئے ؛

حکیم سید حسین میرے عزیز ہی نہیں بزرگ بھی ہیں اور دوست بھی۔ میں نے بچپن میں ان سے پڑھا ہے۔ جوانی میں انکی رفاقت رہی ہے ۱۹۴۷ء سے پہلے یہ قطب روڈ پر مطب کرتے تھے۔ پھر حضرت نظام الدین کی بستی میں آ رہے تو یہیں مطب کرنے لگے۔ تقسیم کے بعد انہوں نے جمعیت علمائے ہند میں شمولیت اختیار کر لی تھی اور مسلمانوں کے حق و مفادات کے تحفظ کا بیڑا اٹھایا تھا۔ جو مساجد اور مقبرے فسادات کے زمانے میں ویران ہو گئے تھے یا اُن پر غیر مسلموں نے قبضہ کر لیا تھا حکیم صاحب نے انہیں واگذار کرانے اور انکی آبادی و حفاظت کیلئے بڑا کام کیا۔ اس کے علاوہ ان کا اہم ترین کارنامہ یہ ہے کہ بعض دیہات جن کی مسلم آبادی نے حالات سے مجبور ہو کر اپنا مذہب تبدیل کر کے ہندو دھرم اختیار کر لیا تھا اُن کے دل سے ہندو بلوائیوں کا خوف نکال کر انہیں دوبارہ اسلام کے دائرے میں داخل کیا۔ مزید برآں جو مسلمانوں کی وقف املاک فسادات کے بعد ناجائز قابضین کے تصرف میں آ گئی تھیں اُن سے خالی کرا کے اُن کا معقول انتظام کیا چنانچہ اس وقت وہ ہندوستان کے مسلم وقف بورڈ کے رکن ہیں اور مسلم اوقاف کی دیکھ بھال میں اپنا زیادہ سے زیادہ وقت صرف کرتے ہیں۔

Marfat.com

حکیم صاحب بڑے زندہ دِل انسان ہیں۔ شعر و سخن کا بھی اعلیٰ ذوق رکھتے ہیں حیدر صاحب کے بلیشمار اشعار انہیں ازبر ہیں۔ انہوں نے مجھے ایک قلمی بیاض دکھائی جس میں انہوں نے اپنی یادداشت سے حیدر صاحب کے ایسے اشعار بھی لکھے ہوئے تھے جو ان کے دیوان میں شامل نہیں۔ حکیم صاحب نے اپنے بھائی علامہ اخلاق کی طرح باقاعدہ لکھنے لکھانے کا شغل تو اختیار نہیں کیا لیکن جب لکھتے ہیں تو دہلی کی زبان کا مزا آجاتا ہے۔

۱۹۴۷ء سے پہلے انہوں نے میرے الہام میں مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا جسے کافی مقبولیت حاصل ہوئی تھی۔ پھر یہ بساط الٹ گئی۔ الہام میرے ساتھ ہجرت کر کے دہلی سے بہاولپور آگیا۔ ملکوں کی حد بندیاں ہمارے روابط کی راہ میں حائل ہو گئیں۔ صرف ایک بار حکیم صاحب پاکستان آئے تھے تو مجھ سے ملنے بہاولپور بھی آگئے تھے۔ پھر خط و کتابت کا سلسلہ بھی برائے نام رہ گیا تھا۔ لیکن میری یاد نہ ان کے دل سے نکلی نہ میں کبھی انکو فراموش کر سکا۔ آج اتنی مدت بعد ملے تھے لیکن جو خلوص، محبت اور اپنائیت پہلے تھی وہ آج بھی نظر آرہی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے ہم کبھی جدا ہی نہیں تھے۔ باتیں کرتے کرتے صبح ہونے کو آئی تو میری آنکھ لگ گئی اور حکیم صاحب بھی سو گئے۔ صبح علامہ صاحب نے آکر جگایا تو ہم اُٹھے۔

حضرت خواجہ باقی باللہ کے مزار پر حاضری:

ناشتے سے فارغ ہو کر حکیم صاحب کیساتھ میں حضرت خواجہ باقی باللہ کیلئے روانہ ہو گیا۔ کوئی بس سیدھی باقی باللہ کو نہیں جاتی اسلئے ہم کچھ دور جا کر بس سے اُتر گئے اور ایک ٹانگہ کر کے منزلِ مقصود کی طرف چل پڑے خواجہ باقی باللہ کی درگاہ جوں کی توں موجود تھی۔ یہاں مسجد کے دروازے کے باہر میرے دادا میر حسن رضوی مرحوم کی قبر تھی جو دوسری قبروں کی نسبت ذرا اونچی تھی۔ میری

Marfat.com

نظروں میں اسکا نقشہ موجود تھا۔ لہذا جب میں وہاں پہنچا تو اسی حالت میں اسے اپنی اصل جگہ پر دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی چنانچہ سب سے پہلے میں نے وہاں فاتحہ پڑھی اور دِل ہی دل میں اپنے دادا سے کہا کہ "ہم آخری بار جب آپ کے پاس آئے تھے تو ہمارے بھائی ابا بھی ہمارے ساتھ تھے لیکن آج میں تنہا آپ کی خدمت میں آیا ہوں۔ بھائی ابا کو بہاولپور کی خاک نے چھپا لیا ہے لیکن روحانی رشتے تو ہر مسافت اور دوری سے ماورئی ہوتے ہیں۔ وہ تو اب بھی آپ کے پاس آتے ہونگے۔ میں ان خیالات میں محو خاموش کھڑا تھا کہ حکیم صاحب نے کہا " حضرت خواجہ باقی باللہ کے ہاں تو حاضری دے لو۔ چنانچہ میں مسجد کے صحن سے گذر کر آپ کے مزار پر حاضر ہوا اور فاتحہ پڑھی۔

حضرت خواجہ باقی باللہ دسویں صدی ہجری کے جلیل القدر بزرگ ہیں۔ ہندوستان میں نقشبندیہ سلسلہ آپ سے ہی چلا ہے۔ حضرت شیخ احمد سرہندی معروف بہ مجدّد الف ثانی رح کو آپ سے ہی بیعت و خلافت کا شرف حاصل تھا۔ آپ کے مزار سے متصل اور بھی بزرگوں کے مدفن ہیں۔ یہ کافی بڑا قبرستان تھا جس کی بیشمار قبریں فسادات سے مسمار ہوگئی تھیں اور وہاں مکانات وغیرہ تعمیر ہوگئے تھے۔ اب بقیہ قبرستان کو وہاں چار دیواری بنا کر محفوظ کر دیا گیا ہے۔

قدم شریف :

یہاں سے ہم قدم شریف پہنچے جو خواجہ باقی باللہ سے تھوڑے ہی فاصلے پر ہے۔ قدم شریف کے متعلق یہ روایت تاریخی کتب میں ملتی ہے کہ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت علیہ الرحمتہ مدینہ منورہ سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نقش قدم جو ایک پتھر پر ثبت تھا اپنے ساتھ ہندوستان لائے تھے یہ زمانہ شاہ فیروز تغلق کا تھا جو حضرت مخدوم کا عقیدت مند تھا۔ جب قدم مبارک

Marfat.com

کا نشان والا پتھر سلطان نے دیکھا تو اس نے سر آنکھوں پر رکھا اور یہ وصیت کی کہ اس کے مرنے کے بعد یہ قدم مبارک اسکی قبر کے تعویز پر لگا دیا جائے تاکہ اس کا سینہ اس کے فیض سے منور رہے۔ اس وقت اسکا بیٹا فتح خاں بھی موجود تھا جس نے کہا کہ اگر سلطان سے پہلے وہ فوت ہو جائے تو یہ نشان قدم اسکے سینے پر آویزاں کر دیا جائے۔ چنانچہ یہی طے پایا کہ جو پہلے وفات پائے گا۔ اس نشانِ قدم کا وہی حقدار قرار پائے گا۔ خدا کی قدرت سے سلطان فیروز شاہ سے پہلے فتح خاں کا انتقال ہو گیا اور حسبِ وصیت اسکی قبر بنی تو قبر کے تعویز کی جگہ یہ قدم مبارک نصب کر دیا گیا۔ بعد میں فیروز تغلق نے اس قبر پر ایک حوض اور اسکے گرد سنگ مرمر کا ایک کٹہرہ بنوا دیا۔ حوض میں پانی بھرا رہتا تھا۔ عقیدت مند اس حوض کا پانی تبرکاً لے جاتے اور بیماروں کو پلاتے جس سے انہیں شفا ہو جاتی تھی۔ اہل دہلی کو اس جگہ سے بڑی عقیدت تھی اور بڑے بڑے امراء و رؤسا اس کے جوار میں دفن ہونے کی تمنا کرتے تھے۔ اکثر علماء و مشائخ نے اس قدم مبارک کی زیارت کی ہے چنانچہ شاہ عبدالعزیز، شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین نے اسکی برکات و تقدس کا ذکر کیا ہے۔ شاہ عبدالحق محدث دہلوی کو اسکی تولیت تفویض تھی۔

یہاں پہنچ کر مجھے بہت رنج ہوا۔ کیونکہ قدم شریف کا نشان یہاں سے غائب تھا کسی بدبخت نے اسے وہاں سے ہٹا کر شہزادہ فتح خاں کے مزار کا تعویز جو اہلِ دہلی کی عقیدت کا مرکز تھا بے نشاں کر دیا ہے۔ بہر حال میں نے اس کا تصور کر کے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں درود و سلام کا نذرانہ پیش کیا اور اس جگہ کی حالتِ زار پر افسوس کرتا ہوا قدم شریف سے باہر آیا۔ طبیعت بہت بجھی بجھی تھی۔ حکیم صاحب کہنے لگے آؤ عیدگاہ بھی دیکھتے چلو۔ شاید اس میں کچھ تمہیں تبدیلی نظر آئے کسی زمانے میں یہاں عیدین کی نمازوں میں بڑا بھاری بھاری اجتماع ہوتا تھا۔ لیکن عیدگاہ کے میدان

Marfat.com

کے گرد کوئی چار دیواری نہ تھی اور عیدین کی نمازوں کے بعد اسکی صفائی ستھرائی کا کوئی معقول انتظام نہیں ہوتا تھا لیکن اب میں نے دیکھا کہ عیدگاہ اور اسکے میدان کے گرد پختہ چار دیواری بنادی گئی ہے میدان میں گھاس کے خوبصورت پلاٹ بنا دیے گئے ہیں۔ عیدگاہ اندر سے بھی بہت صاف ستھری نظر آئی جگہ جگہ سایہ دار درختوں نے اس کے حسن کو دوبالا کر دیا ہے۔ میں نے حکیم صاحب سے پوچھا کہ یہ سب کرامت کس کی ہے تو وہ مسکرا کے بولے یکے از منتظمین میں بھی ہوں۔ میں نے اُن کے حسن انتظام کی داد دی۔

چاندنی چوک میں مشکل سے تین چار دکانیں مسلمانوں کی ہیں۔

یہاں سے قطب روڈ، کھاری باؤلی صدر بازار اور فتح پوری ہوتا ہوا چاندنی چوک پہنچا۔ یہاں پہلے سے کہیں زیادہ رونق تھی، چلتے ہوئے کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ لیکن یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ جہاں تیس چالیس فیصد دکانیں مسلمانوں کی ہوتی تھیں وہاں اب مسلمانوں کی دکانیں مشکل سے تین چار ہونگی۔ چلتے چلتے ہم فوارے تک گئے۔ یہیں سکھوں کا گردوارہ ہے جہمیں ضرورت سے زیادہ چہل پہل نظر آئی۔ اسکے ساتھ ہی کوتوالی اور سنہری مسجد ہے جہاں کبھی مفتی کفایت اللہ کی نشست ہوا کرتی تھی لیکن اب اس مسجد میں شاید نماز پڑھنے والا کوئی نہیں۔

غیر مسلم اسلام کے مبلغ:

چاندنی چوک میں حکیم صاحب ایک صاحب کی دکان پر لے گئے اس کے مالک راولپنڈی کے موتی رام صراف ہیں جو ۱۹۴۷ء میں ترک سکونت کر کے یہاں آباد ہوئے ہیں۔ بڑے خوش خلق اور ملنسار ہونے کے علاوہ انسانیت دوست بھی ہیں اور تمام مذاہب کو انسان دوستی کے معاملے میں ایک مرکز پر تصور کرتے ہیں

Marfat.com

انہوں نے قرآن حکیم کی تعلیم بھی حاصل کی ہے۔ گیتا اور گرنتھ بھی پڑھی ہے اور انجیل کا مطالعہ بھی کیا ہے۔ وہ اپنے خیالات کو کتابچوں کی صورت میں چھاپ کر مفت تقسیم کرتے ہیں۔ ایک کتابچے میں جس کا عنوان ہے "ہے کوئی جو اسطرح سوچے؟" وہ رقمطراز ہیں۔

"میں نے خود قرآن کے ان احکام کو (کہ اے ایمان والو! خدا سے ڈرتے رہو اور اسکے قرب حاصل کرنے کا ذریعہ تلاش کرو اور یہ کہ خدا کے بارے میں کسی باخبر سے دریافت کرو) عملی شکل دینے کیلئے زندگی کے چالیس سال گذارے۔ در در کی ٹھوکریں کھانے کیبعد اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آج ایک ایسے خدا شناس بزرگ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا جس کے مہر و کرم سے اب میں دیدارِ الٰہی کر سکا ہوں اور حق کی جستجو میں سرگرداں اصحاب کو خوش آمدید کہنے کیلئے منتظر ہوں۔"

انہوں نے روحِ اسلام، اسلام برائے خاص و عام اور ایک خدا، ایک مذہب ایک قوم کے نام سے متعدد کتابچے اور پمفلٹ شائع کئے ہیں جن میں جگہ جگہ قرآنی آیات کا سہارا لیا گیا ہے۔ انہوں نے یہ کتابچے مجھے بھی عنایت کئے اور اتحاد و اخوت کے موضوع پر کافی دیر تک گفتگو بھی کرتے رہے۔ میں نے محسوس کیا کہ انسان دوستی کے جذبے میں کافی مخلص ہیں اور اپنا پیغام ذاتی روپیہ صرف کرکے دوسروں تک پہنچاتے رہتے ہیں۔ کاش یہ جذبہ ہندوستان کے دوسرے افراد آبادی میں بھی پیدا ہو اور وہاں مسلمان مذہبی عصبیت کا شکار نہ ہوسکیں۔

میر مشتاق نے اپنی کتاب مضامین میر عنایت کی:

یہاں سے ہم دریبہ ہوتے ہوئے جامع مسجد کے اردو بازار میں میر مشتاق احمد کے دفتر پہنچے۔ یہ دہلی کی مشہور سیاسی و علمی شخصیت ہیں۔ دہلی

Marfat.com

کارپوریشن کے ممبر بھی رہے ہیں۔ ان سے میری ملاقات تو لال محل بستی نظام الدین میں ہی ہو چکی تھی جب وہ علامہ اخلاق صاحب سے ملنے آئے تھے۔ تاہم حکیم صاحب کے ساتھ آج ان کے دفتر پہنچا تو انھوں نے کہا کہ اچھا ہوا آپ آگئے۔ میں آپ کو اپنی ایک کتاب دینی چاہتا تھا۔ اگر آپ نہ آتے تو مجھے نظام الدین جانا پڑتا۔ یہ کہہ کر انھوں نے اپنی کتاب "مضامین میں" اپنے دستخط کر کے مجھے عنایت کی۔ کتاب مختلف مضامین پر مشتمل ہے جن میں "جنگِ آزادی میں دلی کا حصہ" "جب دلی جل رہی تھی" اور ۱۸۵۷ء سے پہلے ہندو مسلم تعلقات کے علاوہ بعض سیاسی شخصیتوں کے سوانحی خاکے بھی ہیں جن میں فخرالدین علی احمد، اندرا گاندھی، بال گنگا دھر، گوپال کرشن گوکھلے مسٹر، آصف علی، ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور ایسے ہی دیگر متعدد حضرات شامل ہیں۔

میر مشتاق احمد کے دفتر کے ساتھ ہی ایک کوآپریٹو بنک ہے جہاں حکیم صاحب نے اپنے ایک ہندو دوست سے ملاقات کرائی۔ وہیں دلی کے شریف خاندانوں میں سے ایک نوجوان ملے جو میرے داماد منصورالرحمٰن کے قریبی رشتے دار ہیں۔ یہ دونوں صاحبان بڑے خلیق تھے۔ حکیم صاحب سے ان کی چہلیں ہوتی رہیں۔ شام ہو چلی تھی۔ حکیم صاحب کے ہندو دوست دفتر سے اٹھنے لگے تو بولے: "آئیے میں آپ کو نظام الدین چھوڑ دوں گا۔ انھیں وہیں قریب ایک بستی میں جانا تھا۔ چنانچہ ان کے ساتھ ہم ٹیکسی میں بیٹھ کر نظام الدین تک آئے۔ تو ٹیکسی میں سے اترتے ہوئے انھوں نے ہمیں اپنے ہاں جمعہ کی دعوت دی اور کہا کہ ہم نمازِ جمعہ جامع مسجد میں پڑھ کر ان کے دفتر آجائیں۔ انھوں نے اس خلوص سے یہ دعوت دی تھی کہ ہم انکار نہ کر سکے۔ لال محل پہنچے تو کئی احباب منتظر تھے جن کے ساتھ رات گئے تک محفل شعر و سخن برپا رہی۔

Marfat.com

خواجہ حسن ثانی نظامی نے بتایا کہ اُن کے پاس خواجہ غلام فرید کے بہت سے خطوط ھیں:

صبح ناشتے کے بعد میں نے خواجہ نثار صاحب سے کہا کہ خواجہ حسن ثانی نظامی سے ابھی تک ملاقات نہیں ہو سکی ہے. کیوں نہ آج اُن سے مل لیا جائے کہنے لگے چلو میں ساتھ چلتا ہوں. چنانچہ اُن کے ساتھ میں خواجہ حسن ثانی نظامی کے ہاں گیا۔ میری اُن کے ساتھ بھی دُور پرے کی قرابت داری ہے. حال احوال کے تبادلہ کے بعد بہت دیر تک اُن سے خواجہ حسن نظامی مرحوم کی تصانیف کے سلسلے میں گفتگو ہوتی رہی. میں نے اُن سے کہا تھا کہ خواجہ صاحب کی تصانیف کی مانگ پاکستان میں کافی ہے. لیکن وہاں لوگوں کو کوئی کتاب نہیں ملتی. آپ اس کا کوئی انتظام کریں. انہوں نے کہا کہ اب یہ انتظام کر لیا گیا ہے اور اب پاکستان میں خواجہ صاحب کی تصانیف مل سکیں گی. میں نے خواجہ حسن ثانی نظامی کو بتایا کہ خواجہ صاحب کی کسی تحریر کے حوالے سے یہ بات کئی کتابوں میں درج ہے کہ جب خواجہ حسن نظامی مرحوم نواب بہاولپور کے محل میں تشریف لے گئے تو انہوں نے دیکھا کہ خواجہ غلام فرید؟ بچوں والی گاڑی میں بیٹھے ہوئے ہیں اور نواب صاحب اُسے آہستہ آہستہ چلا رہے ہیں" میں نے دریافت کیا کہ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ خواجہ صاحب نے یہ بات اپنے کس مضمون یا کتاب میں لکھی ہے. انہوں نے اس سلسلے میں اپنی لاعلمی کا اظہار کیا تاہم انہوں نے کہا کہ وہ اب خاص طور پر ایسی کسی تحریر کا کھوج لگائیں گے. خواجہ حسن ثانی نظامی نے دورانِ گفتگو بتایا کہ اُن کے دادا خواجہ عاشق علی مرحوم سے خواجہ غلام فرید علیہ الرحمتہ کے خصوصی تعلقات تھے. ان کے ساتھ خط و کتابت کا سلسلہ بھی رہتا تھا اور کبھی کبھار خواجہ صاحب اپنا تازہ کلام بھی میرے دادا کو بھیجا کرتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ میرے دادا کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ پڑھے

Marfat.com

لکھے نہیں تھے لیکن اُن کے نام خواجہ صاحب کے خطوط پر مسلہ کلام کو دیکھ کر اس بات کی تردید ہوتی ہے کیونکہ اگر وہ ان پڑھ ہوتے تو خواجہ صاحب اپنا کلام انہیں کیوں بھیجتے خواجہ غلام فرید کے سوانح نگار کی حیثیت سے یہ گفتگو میرے لئے کافی دلچسپی کا موجب تھی چنانچہ خواجہ حسن ثانی نظامی سے میں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ اگر خواجہ غلام فرید کے لکھے ہوئے خطوط اور اُن کے بھیجے ہوئے کلام کی فوٹوسٹیٹ کاپیاں مجھے عنایت کردیں تو میں ان کا بے حد ممنون ہوں گا خواجہ حسن ثانی صاحب نے کہا کہ پرانے کاغذات بہت گڈمڈ ہیں۔ ان خطوط کو نکالنے میں کچھ وقت لگے گا تاہم انہوں نے کہا کہ وہ تلاش کر کے مجھے ضرور عنایت کردیں گے۔

دِلّی کی کوچہ گردی :

آج کچھ دلی والوں سے ملنے کا پروگرام تھا لہذا خواجہ صاحب کے ہاں سے فارغ ہو کر میں حکیم سید حسین صاحب کے ہمراہ روانہ ہوا اور بس سے دریا گنج پہنچ کر قاضی واڑہ ہوتے ہوئے ہم کوچہ چیلان کی طرف چل دیے قاضی واڑہ فیض بازار کے سرے پر ہے۔ یہاں میرے خالو قاضی فیاض اللہ مرحوم رہا کرتے تھے۔ یہ پہلے حیدر آباد دکن میں ملازم تھے۔ پھر وہاں سے ریٹائر ہو کر مستقل طور پر دلی میں آ گئے تھے۔ میں اُن کے مکان کے پاس سے گذرا تو اپنے بچپن کا وقت یاد آگیا جب پتنگ بازی کے شوق میں اکثر یہاں آجایا کرتا تھا۔ میرے خالو بھی بچپن سے پتنگ بازی کے رسیا تھے اور کبھی کبھی اپنے بچپن کے ساتھیوں کے ساتھ اپنی اس پرانی دلچسپی کا اعادہ کر لیا کرتے تھے۔ میرے ایک عزیز حکیم اشفاق احمد مرحوم بھی کبھی کبھار پتنگ بازی کے دو دو ہاتھ کرنے یہاں آجایا کرتے تھے۔ میں بھی اسی شوق میں آتا تھا اور اپنی خالہ زاد بہن سے کہہ کر کوئی اچھی سی پتنگ لے کر اپنے گھر آجایا کرتا تھا۔

Marfat.com

قاضی واڑہ سے نکل کر ہم کوچہ چیلان میں آگئے۔ یہ کبھی ادیبوں، شاعروں اور مصنفوں کا مسکن تھا۔ یہیں منشی ذکاء اللہ، محمد حسین آزاد اور علامہ راشد الخیری کے مکانات تھے۔ میں اکثر "عصمت" اور "بنات" کے دفتر میں جاتا تھا۔ مولانا رازق الخیری اور ان کے چھوٹے بھائی صادق الخیری مجھ پر بڑی شفقت فرماتے تھے۔ سچ پوچھئے تو میری مضمون نگاری کا شوق آپ ہی کی صحبت میں پروان چڑھا ہے۔ یہ میرے مضامین نظم و نثر بڑے شوق سے اپنے رسالوں میں چھاپتے تھے۔ آغا محمد طاہر نبیرۂ محمد حسین آزاد بھی میرے مربی تھے۔ اس محلے میں میری ملاقات شیخ محمد اکرم بیرسٹر سے بھی ہوئی جو سر عبدالقادر مرحوم کے رسالہ مخزن کے ایڈیٹر رہے تھے۔ آصف علی بیرسٹر کا مکان بھی یہیں تھا۔ جہاں مولانا ابوالکلام آزاد کی مجلسیں بھی جمتی تھیں۔ کامیاب دواخانہ اور ماہنامہ نقاد کے مالک مولانا ظفر نیازی کا دفتر بھی اسی محلے میں تھا جنکے پاس میرا آنا جانا تھا۔ آج جب اس محلے سے گذر رہا تھا تو رہ رہ کر پرانی باتیں یاد آرہی تھیں۔ مکانات تو اب بھی ویسے ہی نظر آرہے تھے لیکن انکے وہ مکین نہ تھے۔

مرزا مظہر جان جاناں کے مزار پر حاضری:

یہاں سے ہم کوچہ میر ہاشم پہنچے اور مرزا مظہر جان جاناں کے مزار پر حاضری دی۔ مرزا صاحب بڑے عابد و زاہد انسان تھے اور صاحب ارشاد بزرگ تھے۔ خانوادہ مجددیہ سے خلافت بھی حاصل تھی۔ فن شعر میں بھی مرتبۂ کمال کو پہنچے ہوئے تھے۔ کسی ناہنجار نے طپنچہ مار کر آپ کو شہید کر دیا تھا۔ اپنے انتقال سے پہلے انہوں نے یہ شعر کہا تھا جو لوحِ مزار کی زینت ہے۔

بہ لوحِ تربتِ من یافتند از غیب تحریرے
کہ ایں مقتول را جز بے گناہی نیست تقصیرے

Marfat.com

مرزا جانِ جاناں کے مزار کے ساتھ ہی شاہ غلام علی شاہ ابوالخیر اور شاہ ابوسعید کے مزارات ہیں۔ یہ سب حضرات نقشبندیہ سلسلے کے جید بزرگ تھے۔ جا لقاہ مرزا مظہر جانِ جاناں کے ساتھ ایک خوبصورت مسجد بھی ہے۔ جو یہاں کے لوگوں کے حسنِ انتظام کی آئینہ دار ہے۔

مُغلیہ خاندان کی نشانی :

یہاں سے حکیم صاحب مجھے تیمور جہاں بیگم کے ہاں لے گئے۔ یہ مرزا سلیمان جاہ کی پوتی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں مغلیہ خاندان کی نشانی۔ ان دنوں صاحبِ فراش ہیں۔ فالج کا حملہ ہوا ہے جس کی وجہ سے چلنے پھرنے سے معذور ہیں۔ تاہم بات چیت کرتی ہیں اور زندہ دِلی و خوش گفتاری قائم ہے۔ دہلی کے پرانے خاندانوں کے حوالے سے حکیم صاحب نے میرا تعارف کرایا۔ تو وہ بولیں اب دِلی اور دِلی والے کہاں ؟

ع اک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے۔

اتنے میں اُن کے صاحبزادے، صاحبزادیاں اور داماد بھی آگئے۔ ایک بیٹی علی گڑھ یونیورسٹی لائبریری کی انچارج ہیں اور دوسری دِلی یونیورسٹی میں پڑھاتی ہیں۔ صاحبزادے دِلی میوزیم کے انچارج ہیں۔ یہاں پر تکلف چائے سے تواضع ہوئی اور پرلطف علمی و ادبی گفتگو ہوتی رہی۔

جشنِ سُلطانی میں شرکت :

شام کو غالب اکیڈمی میں حضرت محبوب الٰہی کے سات سو چھیاسٹھویں یوم پیدائش کے سلسلے میں جشنِ سُلطانی کی تقریب تھی۔ پیر صفدر نظامی جو درگاہ شریف کے بڑے پیر کہلاتے ہیں۔ اس کے مہتمم و منتظم ہیں۔ اس تقریب سے بہت سے حضرات نے خطاب کیا۔ کچھ ممبر پارلیمینٹ اور وزیر بھی آئے ہوئے تھے۔ یں

Marfat.com

نے بھی اس موقع کی نسبت سے ایک نظم سُنائی۔ تقاریر کے بعد دعوتِ طعام تھی جس کا اہتمام کچھ عقیدت مند ہندو صاحبان کی طرف سے تھا۔ آخر میں محفلِ سماع ہوئی جو کئی گھنٹے جاری رہی۔ یہاں سے لال محل آیا تو اسی قسم کی ایک تقریب کا دعوت نامہ ملا جو میر ضامن صاحب کی طرف سے تھا۔ میر ضامن سے میری قرابت بھی ہے لیکن افسوس میں انکی تقریب میں شرکت نہ کر سکا اور کچھ دوسری مصروفیات میں گھرا رہا۔

دلی کی کچہری :

آج حکیم صاحب کو کچہری میں کچھ کام تھا۔ میں بھی اُن کے ساتھ چلا گیا تاکہ دیکھوں کہ ۱۹۴۷ء سے پہلے کی کچہری اور آج کی کچہری میں کیا تبدیلی واقع ہوئی ہے۔ یہ ہے تو اب بھی کشمیری دروازے کے باہر لیکن اب پہلے کی طرح یہاں کھلا میدان نہیں بلکہ اسکی جگہ بہت عمدہ اور دو منزلہ عمارت بن گئی ہے وکلاء کیلئے بھی کافی بڑی جگہ علیحدہ بنی ہوئی ہے جہاں اِن کے دفتر ہیں۔ یہیں قدسیہ باغ اور پردہ کلب ہوا کرتا تھا لیکن اب ان کی جگہ کچھ اور عمارتیں بن گئی ہیں۔ ان کا کچھ حصّہ سڑکوں میں آگیا ہے۔ کشمیری دروازے کے باہر اسلحہ کی جو دکان پہلے تھی وہ اب بھی ہے۔ مجھے کشمیری دروازے سے گزرتے ہوئے ۱۹۲۰ء کا وہ زمانہ یاد آگیا جب میں فوج میں ایجوکیشن انسٹرکٹر تھا اور انگریز فوجی افسروں کو اردو پڑھاتا تھا۔ میری ڈیوٹی کے قریب ایک فوجی ٹریننگ سنٹر میں تھی اور میں یہیں سے روز گزرا کرتا تھا۔ البتہ یہاں سپنسرز کی وہ دکان نہیں ہے جہاں میں اپنی ڈیوٹی سے واپسی پر شام کے وقت دودھ کی ٹھنڈی بوتل پیا کرتا تھا۔

مُسلمانوں کے مستقبل سے مایوس نہیں :

یہاں بسوں کا انٹرنیشنل اڈا دیکھا جہاں سے ہندوستان کے ہر کونے میں بسیں جاتی ہیں۔ یہ اڈا بڑا خوبصورت اور اسکی کئی منزلہ عمارت ہے۔

Marfat.com

کشمیری دروازے سے میں حکیم صاحب کیساتھ چاندنی چوک میں اور چاندنی چوک سے بلی ماران آیا۔ یہاں ایک مسلمان سوداگر سے ملاقات ہوئی۔ یہ ہیں تو دہلی کے رہنے والے لیکن میری پہلے ان سے ملاقات نہ تھی۔ دین کا درد رکھتے ہیں۔ انہوں نے دہلی کی بعض مساجد کی مرمت وغیرہ پر زرِ کثیر صرف کیا ہے۔ اور انہیں از سرِ نو آباد کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ یہ ہندوستان میں اسلام کے خاموش مبلغ ہیں۔ کہتے تھے کہ بعض اوقات پروپیگنڈے سے اس راہ میں دشواریاں حائل ہوجاتی ہیں۔ اسلئے غیر مسلموں کے اسلام قبول کرنے کی خبریں اگر اخبارات کی زینت نہ بنیں تو زیادہ بہتر ہے۔ یہ ہندوستان میں مسلمانوں کے مستقبل سے بھی مایوس نہیں ہیں۔ کہتے تھے کہ مسلمان حالات کا مقابلہ کرنے کی ہمت رکھتے ہیں۔ انہوں نے بہت حد تک اپنے آپ کو سنبھال لیا ہے اور آئندہ ان کے اقتصادی و معاشی حالات بہتر ہونے کی توقع ہے

بلی ماران بھی کوچہ چیلان کی طرح دہلی کا بہت مشہور محلہ ہے۔ یہ بھی علماء و ادباء اور حکماء کا مسکن رہا ہے۔ مرزا غالب بھی یہیں کی گلی قاسم جان میں رہتے تھے یہیں حکیم محمود خاں اور حکیم اجمل خاں کے مطب تھے۔ ہندوستانی دواخانہ اب تک یہاں موجود ہے یہاں بڑے بڑے سیاسی اجتماع بھی ہوتے رہے ہیں۔ شرفاء خانیوں کے اکثر مکانات اب دوسرے لوگوں کے قبضے میں ہے۔ حکیم اجمل خاں کے مکان پر بھی ایک ہوٹل کا بورڈ نظر آیا۔ اس محلے میں میرے بھی کئی اعزاء کے مکانات تھے۔ حکیم نیاز احمد، حکیم اشفاق احمد اور حکیم مختار احمد یہیں رہتے تھے۔ میری خالہ زاد بہن کے خاوند حکیم عبدالصمد اور میرے سمدھی عزیز الرحمٰن بھی یہیں رہائش رکھتے تھے۔ بلی ماران میں ہی نواب خضر مرحوم کی حویلی تھی۔ اس حویلی میں اب ایک بنیک قائم ہے۔ البتہ ان کے ایک عزیز اس سے ملحقہ ایک مکان میں رہتے ہیں۔ حکیم صاحب مجھے ان سے ملوانے لے گئے۔

Marfat.com

میر پنجہ کش کے قطعات:

ان کے ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو دیوار پر آویزاں چند قطعات دیکھ کر میں فوراً پہچان گیا کہ یہ ہوں نہ ہوں میر پنجہ کش کے فن خطاطی کے نمونے ہیں چنانچہ میں نے صاحب خانہ سے دریافت کیا تو انہوں نے میری تائید کی اور تعجب بھی کیا کہ میں ایک نظر میں یہ کیسے پہچان گیا۔ کہ یہ میر پنجہ کش کی ہی تحریریں ہیں۔ دراصل میر پنجہ کش کی اکثر تحریریں میری نظروں سے گزری تھیں اور میرے والد کے پاس بھی ان کے کئی قطعات تھے اسلئے مجھے انکی شناخت میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ میر پنجہ کش اپنے وقت کے بہت مشہور خطاط تھے۔ کہتے ہیں اگر کوئی فقیر اُن کے پاس آتا اور وہ کام میں مصروف ہوتے تو کاغذ کا کوئی ٹکڑا اُٹھا کر ایک آدھ لفظ لکھ کر اُسے دے دیتے جسے قدردان ہاتھوں ہاتھ لیتے۔ پنجہ کش انہیں اسلئے کہتے تھے کہ وہ پنجہ لڑانے میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ اور تعجب کی بات یہ تھی کہ پنجہ کشی کے باوجود خطاطی میں بھی ان کا ہاتھ خوب چلتا تھا۔

نواب خضر مرحوم کا نام غالباً اقبال تھا۔ بڑے خلیق اور متواضع انسان تھے۔ دلی والوں کی خوبو ان میں باقی تھی۔ انہوں نے چائے وغیرہ سے بھی تواضع کی اور اگلے روز کھانے کی بھی دعوت دی۔ میں نے اس مہمان نوازی پر فی البدیہہ یہ شعر کہا۔

حالات کا یہ طرفہ تماشہ بھی دیکھئے
مہمان بن کے آئے ہیں اپنے وطن میں ہم

آب جو کی رسم اجراء:

شام کو بزم انصاری کے مجموعۂ کلام "آبجو" کی رسم اجرا کی تقریب غالب اکیڈمی میں تھی۔ بزم انصاری جناب رئیس امروہی کے ساتھ کراچی سے یہاں آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے خاص طور پر مجھے کہلوایا تھا کہ میں اس تقریب میں ضرور

Marfat.com

شریک ہوں اور "آب جو" پر اظہارِ خیال بھی کروں ۔ ان کے پاس خاطر سے میں اس میں شریک ہوا ۔ کنور مہندر سنگھ بیدی تقریب کے صدر تھے اور جناب عارف محمد خاں انفریشن اور براڈ کاسٹنگ کے یونین ڈپٹی منسٹر کو کتاب کی رسمِ اجرا ادا کرنی تھی تقریب سے رئیس امروہی صاحب، صادقین محمد صاحب، ڈاکٹر عالیہ امام، پروفیسر گوپی چند نارنگ، خواجہ حسن ثانی نظامی، ڈاکٹر نثار احمد فاروقی، ڈاکٹر خلیق انجم، متین صدیقی اور گلزار دہلوی کے علاوہ میں نے بھی خطاب کیا اور آب جو کی خوبیوں پر روشنی ڈالی ۔ میں نے اپنی کتاب میں کہا کہ :

"یہ بھی از کراماتِ دہلی ہے کہ ۲۵ سال میں جس شخصیت کا میں پاکستان میں سراغ نہیں لگا سکا تھا اُسے دہلی کے چند روزہ قیام میں دریافت کر لیا ۔ گویا اگر میں دہلی میں نہ آتا تو ایک باصلاحیت اور خوش فکر شاعر سے متعارف ہونے کی سعادت سے محروم رہتا ۔ میں نے بزمِ انصاری کا کلام جستہ جستہ دیکھا ہے اور میرا تاثر یہ ہے کہ ان کے کلام میں قدیم و جدید رنگ کا امتزاج ہے اور زبان و بیان کی خوبیاں اور تجربات و مشاہدات کی خوبصورت عکاسی بھی ہے قابلِ مبارکباد ہیں کہ انکے مجموعہ کلام کی رسمِ اجرا ہندوستان کے دارالحکومت دہلی میں ہوئی ۔ اگر ہندوستان اور پاکستان کے ادبا و شعرا کی طرف سے خیر سگالی کے ایسے مظاہرے ہوتے رہے تو اس سے اردو ادب ترقی میں بڑی مدد ملے گی اور باہمی محبت و دوستی کے جذبات بھی فروغ پائیں گے۔"

مجھ سے اس موقع پر اپنی غزل سنانے کی بھی فرمائش کی گئی تھی جو میں نے پیش کی اور سامعین کی داد بھی وصول کی ۔ آخر میں کنور مہندر سنگھ بیدی نے صدارتی تقریر کی ۔

Marfat.com

بھارت کے عوام پاکستان سے لڑنا نہیں چاہتے :

انہوں نے پاک بھارت دوستی کے سلسلے میں ہندوستانی عوام کے جذبات کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ انہوں نے چنڈی گڑھ کے ایک مشاعرے میں جس میں کئی ہزار کا مجمع تھا لوگوں کو ایمان، دھرم کے واسطہ دیکر یہ دریافت کیا تھا کہ اگر اس مجمع میں کوئی صاحب ایسے ہیں جو پاکستان سے لڑنا چاہتے ہیں وہ مہربانی کر کے اپنا ہاتھ اٹھالیں لیکن میرے بار بار دریافت کرنے پر جب ایک ہاتھ بھی نہ اٹھا تو میں نے اُن سے کہا کہ اچھا اگر آپ دوستی کے خواہاں ہیں تو اپنا ہاتھ اٹھالیں۔ اس پر لوگوں نے ایک کی بجائے دونوں ہاتھ اٹھا لئے۔ انہوں نے کہا کہ دوستی کی یہی خواہش یقیناً پاکستانی عوام کی بھی ہوگی۔ اور کوئی وجہ نہیں کہ ایسے ماحول میں دونوں ملکوں کے درمیان دوستی کے رشتے استوار نہ ہوں۔ اس صدارتی تقریر کے بعد انہوں نے اپنی غزل سنائی جو سادگی و پرکاری کا بہترین نمونہ تھی۔

بلا کشانِ محبت بہ کوئے یار روند :

اگلے دن جمعہ تھا۔ مجھے اور حکیم صاحب کو اپنے ہندو دوست کی دعوت میں شرکت کیلئے جامع مسجد جانا تھا۔ میں نے کہا کیوں نہ ہم جمعہ سے پہلے دہلی کی کچھ اور کوچہ گردی کر لیں۔ حکیم صاحب نے حامی بھر لی اور ہم گھر سے نکل کھڑے ہوئے گویا ؎

علی الصباح کہ مردم بہ کاروبار روند
بلا کشانِ محبت بہ کوئے یار روند

حکیم صاحب پہلے ہائی کورٹ گئے۔ یہاں انہیں کچھ کام تھا۔ ہائی کورٹ کی دو منزلہ عمارت کافی شاندار ہے۔ یہاں سے بعض قدیم عمارات کے آثار دیکھے

Marfat.com

ہوئے اجمیری گیٹ کی طرف روانہ ہوئے۔ آثارِ قدیمہ میں اس مدرسے کی چار دیواری بھی دیکھی جہاں شیخ عبدالحق محدث دہلوی رہا کرتے تھے۔ اجمیری دروازے سے شاہ گنج، گلی شاہ تارا اور پنڈت کے کوچے کے در و دیوار پر حسرت بھری نگاہ ڈالتے ہوئے لال کنویں اور پھر حوض قاضی آ گئے۔ شاہ گنج اور گلی شاہ تارا میں حکیم صاحب نے چند دِلّی والوں سے بھی ملوایا۔ انہیں میں میرے داماد منصور الرحمٰن کے ایک رشتہ دار بھی تھے۔ حوض قاضی کی مسجد کے متولی میرے رشتے کے نانا مولوی عبدالغفار مرحوم تھے۔ ان کے بڑے صاحبزادے مولوی ابوالفضل تو پاکستان میں آ گئے تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی ابوالفتح یہیں رہتے ہیں۔ میں ایک دن اُن کے ہاں گیا تھا لیکن سوئے اتفاق سے وہ گھر پر موجود نہ تھے۔ اب نمازِ جمعہ کا وقت ہو رہا تھا اسلئے یہاں نہ رُک سکے اور سیدھے رکشہ میں بیٹھ کر چاوڑی بازار سے ہوتے ہوئے جامع مسجد آ گئے۔ جامع مسجد پہنچے تو امام سید عبداللہ تقریر کر رہے تھے۔ انہوں نے تقریر کے بعد نمازِ جمعہ پڑھائی۔ میں نے نماز کے بعد اُن سے ملنے کی کوشش کی لیکن وہ اتنے لوگوں میں گھرے ہوئے تھے کہ میں اُن تک نہ پہنچ سکا۔

جامع مسجد کی فریاد :

مسجد کے دروازے کے ساتھ بڑے بڑے کتبے نظر آئے جن پر" بھارتی حکومت سے مسجد کی فریاد" کے عنوان سے احتجاجی فقرے لکھے ہوئے تھے اور یہ شکایت بڑے دلدوز انداز میں درج تھی کہ مسجد کی حالتِ زار پر حکومت کوئی ہمدردی نہیں کرتی۔ میں نے محسوس کیا کہ دہلی کے مسلمان اندرا حکومت سے مطمئن نہیں اور امام عبداللہ اس سلسلے میں بہت زیادہ جذباتی ہیں۔

یہاں سے ہم حکیم صاحب کے ہندو دوست کے دفتر گئے۔ یہاں کھانے کی

Marfat.com

میز پر کھانا چنا ہوا تھا اور چند دوسرے مہمان بھی میزبان کے ساتھ ہمارے منتظر تھے۔ کھانے میں شامی کباب، مرغی کا سالن، مچھلی اور بہت کچھ تھا۔ کافی پیدل چلنے سے بھوک بھی چمک اٹھی تھی۔ اسلئے خوب سیر ہو کر کھایا۔ کھانے کے بعد کافی آگئی اور ہم اپنے میزبان کے ساتھ ہی کار میں بیٹھ کر نظام الدین آگئے۔

دلّی کا حسن کیا ہوا؟

میں نے راستے میں حکیم صاحب سے کہا کہ میر تقی میر نے کبھی دِلّی کے بارے میں کہا تھا ؎

دلّی کے نہ تھے کوچے اوراقِ مصور تھے
جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

ہمارے زمانے تک دِلّی کا یہ پہلو ماند نہیں پڑا تھا۔ لیکن نہ جانے اب کس کی نظر اسکو کھا گئی کہ میں کب سے دلّی کے بازاروں اور گلی کوچوں میں پھر رہا ہوں لیکن اب تک مجھے دِلّی میں کوئی ایسی شکل نظر نہیں آئی جسے مصوّر کا شاہکار کہا جا سکے۔ حکیم صاحب آہ بھر کر بولے "میاں اب وہ دِلی کہاں۔ دلّی والے ہی نہ رہے تو دِلّی کا روایتی حسن کہاں مِلے گا۔

دلّی کی سوغات:

اب مجھے دِلّی میں ۱۶، ۱۷ دن گذر چکے تھے۔ اور واپسی کے دِن قریب آ رہے تھے۔ اسلئے میں نے مزید ملاقاتوں کے سلسلے کو مختصر کیا اور بازاروں میں اس نیت سے گھومنے کا پروگرام بنایا کہ یہاں سے کچھ سوغات پاکستان لیتا چلوں جب میں نے اس سلسلے میں حکیم صاحب سے ذکر کیا تو کہنے لگے۔ یہاں کی کیا چیز پاکستان لے جاؤگے۔ تمہارے ہاں کس چیز کی کمی ہے۔ عورتیں کپڑے لتے" کی فرمائش کرتی ہیں لیکن سُنا ہے کہ تمہارے ہاں کپڑا بڑا نفیس بنتا ہے اور یہاں سے سستا بھی ہے۔ میں

Marfat.com

نے کہا کہ اچھا بنارسی ساڑھیاں اور کندن کا زیور تو دلوا ہی دیجئے یہ چیزیں یہاں کی مشہور بھی ہیں اور اچھی بھی ہوتی ہیں چنانچہ حکیم صاحب مجھے موری دروازے لے گئے جہاں بنارس کے ہی رہنے والے بنارسی ساڑھیوں کا کاروبار کرنے والے ایک صاحب رہتے ہیں۔ میں نے وہاں سینکڑوں بنارسی ساڑھیاں دیکھیں اور ان میں سے دو تین منتخب کر کے خرید لیں، وہاں سے آکر کندن کے زیور خریدنے بچھلی دالان کی ایک تنگ سی گلی میں گئے جہاں زیورات کا کارخانہ ہے کندن کے زیور کے چند سیٹ اور ایک دو گارنٹ کے ہار خریدے۔ جو چیزیں میں نے خریدی تھیں وہ تو تھیں ہی۔ ان کے علاوہ حکیم صاحب نے بہت سے تحائف دیئے۔ مزید برآں میرے ساتھ کتابوں کا بھی اچھا خاصا بوجھ ہو گیا تھا۔ اور چونکہ مجھے ہوائی جہاز سے سفر کرنا تھا جس میں مقررہ وزن کے علاوہ زیادہ سامان نہیں رکھا جا سکتا اسلئے میں نے خریداری اور تحائف کو یہیں ختم کیا۔

دلی کی تمام ادبی انجمنوں کی طرف سے استقبالیہ تقریب:

عزیزم قیصر حیدری نے بتایا کہ آتش بہاولپوری ۱۸ دسمبر کیلئے سونی پت میں میرے اعزاز میں ایک مشاعرے کا دعوت نامہ لیکر آئے تھے لیکن انہوں نے بتا دیا کہ ۱۸ دسمبر کو دہلی کی تمام ادبی انجمنیں میرے اعزاز میں ایک تقریب منعقد کر رہی ہیں اسلئے سونی پت نہیں آسکوں گا واقعی دلی کے ادیبوں اور شاعروں کو ناراض کرنا میرے بس میں نہ تھا اسلئے دیوی دیال آتش بہاولپوری سے معذرت ہی کرنی پڑی اور ۱۸ دسمبر کو شام ۴ بجے دریا گنج میں واقع بچوں کے گھر میں جو تقریب بطورِ خاص میرے لئے منعقد ہو رہی تھی اس میں میں نے شرکت کی۔ اس تقریب کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں دلی کی تمام ادبی انجمنیں شامل تھیں۔ اور ان کی جانب سے نمائندہ ادبا و شعراء اس میں شریک تھے۔ علاوہ ازیں دلی سے نکلنے والے

Marfat.com

تمام اُردو اخبارات کے ایڈیٹر اور نمائندے بھی تشریف لائے تھے۔ اس تقریب کے صدر حکومت کے اعزاز یافتہ شاعر ساغر نظامی صاحب تھے جن میں آج سے ۲۵ سال پہلے کا دم خم تو نہیں تھا لیکن ویسے ماشاءاللہ صحت مند تھے۔ بڑے تپاک سے ملے اور پاکستان کی ادبی سرگرمیوں کے متعلق دریافت کرتے رہے۔ انہیں بہاولپور کا وہ تاریخی مشاعرہ بھی یاد تھا جس میں ہندوستان بھر کے تمام مشہور شعرا کے ساتھ انہوں نے بھی شرکت کی تھی۔ تقریب کی کاروائی شروع ہوئی تو تمام ادبی انجمنوں کے نمائندوں سے میری گل پوشی کرنے کو کہا گیا اور سب نے باری باری میرے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے۔ سٹیج سیکرٹری کے فرائض گلزار دہلوی صاحب کے ذمہ تھے۔ سب سے پہلے انہوں نے بایں الفاظ میرا تعارف کرایا

"آج میں انتہائی خوشی محسوس کر رہا ہوں کہ ہمارا ایک پرانا ساتھی ۲۵ سال بعد ہم سے پھر آملا ہے۔ شہاب دہلی کے رہنے والے ہیں اور یہاں انہوں نے اور ان کے بزرگوں نے سالہا سال تک علم و ادب کے چراغ روشن کئے ہیں ان کے دادا کا اخبار "خیر خواہ عالم" دہلی سے جاری ہونے والے اوّلین اخبارات میں سے تھا۔ انہوں نے اپنے مطبع رضوی سے مذہب، تصوّف اور اُردو ادب پر سینکڑوں کی تعداد میں کتابیں چھاپ کر دنیا میں پہنچائی ہیں۔ شہاب صاحب بھی ۱۹۴۷ء تک ماہنامہ الہام دہلی سے شائع کرتے رہے۔ انہوں نے دہلی کی بزرگوں کی آنکھیں دیکھی ہیں۔ میرے والد تربھون ناتھ زار زتشی بھی اُن پر شفقت فرماتے تھے۔

شہاب صاحب کا یہ ذوقِ ادب پاکستان جاکر مزید پھولا پھلا اور انہوں نے کراچی اور لاہور کے ادبی مرکزوں سے دور رہ کر بہاولپور جیسے شہر میں قابلِ

Marfat.com

رشک ادبی کام کیا ہے۔ یہ دہلی والا الہام بھی اب بہاولپور سے نکالتے ہیں۔ ساتھ ہی وہاں اردو اکیڈمی قائم کر کے انہوں نے درجنوں اپنی۔ اور دوسری بیش قیمت تحقیقی وعلمی کتابیں شائع کی ہیں۔ اس ادارے کا ایک سہ ماہی رسالہ الزبیر بھی ان کی ادارت میں ہی نکلتا ہے جس کے بڑے یادگار اور دقیع نمبر شائع ہوئے ہیں۔

گلزار دہلوی کے بعد ادبی انجمنوں کے نمائندگان اور صحافی حضرات نے باری باری خطاب کیا اور اس توقع کا اظہار کیا کہ ہندوستان اور پاکستان کے ادیبوں اور شاعروں میں محبت وخلوص کے یہ روابط دونوں ملکوں کے خوشگوار تعلقات کا موجب ہوں گے۔ ملاپ کے نیوز ایڈیٹر صاحب کی تقریر کا لب ولہجہ کچھ تلخ تھا جس کا اثر جناب داس اختر صاحب کی سلجھی ہوئی تقریر سے زائل ہوا۔ انہوں نے اپنی ان کوششوں کا بھی ذکر کیا جو انہوں نے مغویہ خواتین کی برآمدگی کے سلسلے میں کیں۔ وہ ہندو پاک دوستی کے بہت بڑے علمبردار ہیں اور اس سلسلے میں صحافتی و ادبی سطح پر کوشش کرتے رہتے ہیں۔ ویسے تقریباً ہر ادیب اور شاعر نے اس موقع پر اپنی تقریر میں اپنی ان خواہشات کا اظہار کیا کہ انکی طرف سے پاکستان کے ادیبوں شاعروں اور صحافیوں کو یہ پیغام پہنچا دیا جائے کہ ہمارے اور آپ کے درمیان ادب کے جو رشتے ہیں وہ پائیدار ہونے چاہئیں۔ مجھے اظہارِ خیال کی دعوت دی گئی تو میں نے دہلی کے ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کا اپنی پذیرائی پر شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

تقدیر کا لکھا اٹل حقیقت بن چکا ہے۔

" ادب قوموں کی امنگوں کا آئینہ دار ہوتا ہے اور شاعر وادیب انہیں احساسات وجذبات کی ترجمانی کرتے ہیں جو معاشرے کی رگ وپے میں جاری وساری ہوتے ہیں، چونکہ اب ماضی کی تلخیوں کو بھلا دینے کا وقت آگیا ہے اور

Marfat.com

تقدیر کا لکھا ہوا اب اٹل حقیقت بن چکا ہے۔ اسلئے پاکستان ہو یا ہندوستان انہیں اب منفی رویوں کو چھوڑ کر مثبت طرزِ عمل اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ دونوں جگہ کے عوام غربت و افلاس کے شکار ہیں اور استحصالی قوتوں سے برد آزما ہیں۔ سب کی تمنا یہ ہے کہ اُن کا ملک ترقی کرے اور غربت و افلاس کے سائے دور ہوں۔ دونوں ملکوں میں اور بھی بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ ادب ہمارا مشترکہ سرمایہ ہے۔ اس میدان میں دونوں ایک ساتھ آگے بڑھے ہیں اور دونوں نے اپنے خونِ جگر سے اسکی آبیاری کی ہے۔ لہٰذا ادب کے معاملے میں انکی سوچ بہت حد تک ایک جیسی ہے ضرورت ہے کہ انہیں باہم میل جول کے مواقع میسر ہوں اور ایک دوسرے کی تخلیقات سے انہیں استفادہ کی آسانیاں حاصل ہوں۔

ڈاک کی سہولتیں ہوں تو دونوں ملکوں کے ادیب ایکدوسرے کی تخلیقات سے استفادہ کرسکتے ہیں:

"یہ ایک بڑا المیہ ہے کہ علمی و ادبی کتب اور رسائل و جرائد کے ترسیل کے راستے دونوں ملکوں میں مسدود ہیں۔ ہم آپکی تخلیقات سے محروم رہتے ہیں اور ہماری تخلیقات آپ کے مطالعہ میں نہیں آتیں۔ پھر ڈاک کا سلسلہ اتنا مہنگا اور مشکل ہے کہ کتابیں وغیرہ تو رہیں ایک طرف ایک معمولی خط کیلئے بھی تین روپے خرچ کرنے پڑتے ہیں اور اگر کوئی ہمت کرکے کتابیں بھیج دے تو سونے سے گھڑا دن مہنگی پڑتی ہیں۔

میری رائے میں اگر دونوں ملکوں کے ادبا، شعرا اور صحافی اپنی اپنی حکومتوں پر زور دیں اور ڈاک کی مشکلات دور ہو جائیں تو اس سے جہاں ادب کی ترقی میں مدد ملے گی وہاں باہم افہام و تفہیم کی راہیں بھی کشادہ ہونگی"

میری تقریر کو سب نے سراہا پھر مجھ سے غزل سنانے کی فرمائش کیگئی تو

Marfat.com

میں نے یہ غزل سنائی جو میں نے ۱۹۴۷ء کے بعد پہلے پہل بہاولپور میں کہی تھی۔

در و دیوارِ وطن یاد آئے — دشتِ غربت میں چمن یاد آئے
پھر اُڑایا مری غربت کا مذاق — پھر وہ یارانِ وطن یاد آئے
کتنی روندی ہوئی لاشیں دیکھیں — کتنے بے گور و کفن یاد آئے
جب کسی بات پہ دل ٹوٹ گیا — کتنے آئینہ شکن یاد آئے!
سائے پھیلے جو تیری زلفوں کے — چاند سورج کے گہن یاد آئے
ہائے امید کا اندازِ شہاب — جیسے ظلمت میں کرن یاد آئے

آخر میں ساغر نظامی صاحب نے بھی مختصر تقریر کی اور اپنے کلام سے بھی نوازا۔
اس تقریب میں بہت سے ادیبوں اور شاعروں سے ملاقات ہوئی تھی۔ کئی صاحبان نے اس موقع پر اپنی تصانیف سے بھی مجھے نوازا۔ رات کو مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کی طرف سے عشائیہ تھا۔ مفتی صاحب خود تو صاحبِ فراش ہیں۔ انکی جگہ اُن کے صاحبزادے نے میری میزبانی کا فرض ادا کیا۔ کھانے کے بعد سب لوگ اظہارِ تشکر کے طور پر مفتی صاحب کے پاس گئے۔ چلتے وقت انہوں نے اپنی کتاب "منارِ صدا" عطا کی جو دراصل انکی ریڈیائی تقریروں کا مجموعہ ہے جو عموماً مذہبی نوعیت کی ہیں ہر مضمون عام فہم اور دلنشیں انداز کے علاوہ مسلک عقیدہ کی بحث سے الگ ہو کر لکھا گیا ہے۔

جمنا داس اختر کا کتب خانہ:

یہاں سے واپسی پر جمنا داس اختر صاحب کہنے لگے کہ "اگر کل کچھ وقت ہو تو میرے ہاں آکر میرا کتب خانہ دیکھیں"۔ یہ پرانے صحافیوں میں سے ہیں حمید نظامی مرحوم نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز ان کی رفاقت میں کیا تھا۔ آج کل یہ دلی سے "سویرا" نکالتے ہیں۔ آرکیالوجی سے انہیں خاص دلچسپی ہے اور اس

Marfat.com

سلسلے میں دسیع مطالعہ کیا ہے۔ انہوں نے جب اپنا کتب خانہ دیکھنے کی دعوت دی تو میرے منہ میں پانی بھر آیا اور حالانکہ اگلا دن میرا دہلی میں آخری دن تھا لیکن میں نے بخوشی انکی دعوت قبول کرلی۔ ان کا گھر تو قرول باغ میں ہے اور دفتر دریا گنج میں، انہوں نے کہا تھا کہ میں صبح ان کے دفتر میں پہنچ جاؤں تو دہاں سے وہ مجھے اپنے ساتھ اپنے گھر لے جائیں گے۔

چنانچہ سب سے پہلے میں نے حکیم صاحب کے ہمراہ پولیس آفس میں جاکر اپنی دالپسی کے متعلق اندراج کیا۔ کیونکہ ہندوستان چھوڑنے سے ۲۴ گھنٹے پہلے یہ اندراج کرانا ضروری ہوتا ہے۔ یہاں کچھ دیر نہیں لگی اور ہم فوراً ہی فارغ ہوکر دریا گنج 'سویرا' کے دفتر پہنچ گئے۔ جمنا داس اختر صاحب میرے منتظر تھے ہمیں دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے اور ہم ٹیکسی میں بیٹھ کر ان کے گھر روانہ ہو گئے۔ یہاں میں جب انکی لائبریری میں داخل ہوا تو میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ پورا کمرہ کتابوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ الماریوں کے علاوہ میزیں بھی کتابوں سے لدی ہوئی تھیں۔ ایک سرے سے دوسرے سرے تک میں نے کتابوں کا جائزہ لیا تو بے ساختہ میرے منہ سے نکلا کہ:

"اختر صاحب آپ نے تو کمال کر دیا۔ تاریخ اور آرکیالوجی کے موضوع پر آج تک میں نے کہیں اتنا بڑا ذخیرہ نہیں دیکھا۔ یہ سب کتابیں آپ نے کہاں کہاں سے جمع کی ہیں"۔

اختر صاحب نے بتایا کہ "اس شوق کی خاطر میں نے اپنا ایک زرعی فارم کھڑے کھڑے بیچ دیا اور یورپ جاکر جو کتابیں ہندوستان اور پاکستان میں نہیں ملتیں دہاں سے لے آیا"۔ داقعی ان میں بعض کتابیں ایسی نایاب ہیں جو یہاں نہیں دستیاب ہو سکتیں۔ یہ اختر صاحب کا ہی کام تھا کہ انہوں نے گھر پھونک تماشہ دیکھ کے

Marfat.com

مقولہ کو سچ کر دکھایا۔ اب تک میں جس کمرے میں گھوم رہا تھا اسی کو اختر صاحب کا اثاثہ سمجھتا تھا لیکن میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب انہوں نے ایک کمرے کی طرف رہنمائی کرتے ہوئے کہا۔ ذرا اسے بھی دیکھتے چلئے۔ یہاں بھی کئی الماریاں کتابوں سے پُر تھیں۔ ان میں ادب اور مذہب کے موضوع پر کتابوں کی کثرت تھی۔ قرآن شریف کے بعض نادر نمونے اور مولانا مودودی کی تفہیم القرآن بھی تھی۔ ایک الماری میں میں فارسی اور اردو ادب کے کلاسیکس کے پنجابی تراجم تھے۔ انہوں نے بتایا کہ یہاں پنجاب یونیورسٹی نے پنجابی میں بہت کام کیا ہے۔ ایک الماری کے پاس کھڑا ہوا میں ٹیکسلا کے موضوع پر جان مارشل کی کتاب دیکھ رہا تھا تو اختر صاحب نے کہا کہ میرے پاس اسکی ایک جلد فالتو ہے جو میں آپکی نذر کر سکتا ہوں چنانچہ ازراہِ کرم اپنے دستخط فرما کر اسکی ایک جلد مجھے عنایت کر دی۔

میں نے واپس آتے ہوئے اختر صاحب سے پوچھا کیا آپ کی اولاد میں سے بھی آپ جیسا کوئی صاحبِ ذوق ہے جو آپ کے اتنے بڑے ذخیرے کی حفاظت کر سکے گا۔ انہوں نے کہا کہ انہیں اسکی کوئی فکر نہیں کیونکہ انہوں نے یہ تمام ذخیرہ کتب بمع الماریوں کے اپنے بعد مولانا ابوالکلام آزاد لائبریری میں منتقل کرنے کی وصیت کر دی ہے۔

فیضِ عام کے اس جذبے کا سُن کر میں دل میں کہنے لگا کہ ہمارے ہاں کتنے ایسے لوگ ہیں جو یہ جذبہ رکھتے ہیں اور اپنی زندگی میں اپنا علمی سرمایہ کسی پبلک لائبریری کو سونپنے کا سوچتے بھی ہوں۔

غالب کا یومِ پیدائش:

آج شام کو مرزا غالب کے یومِ پیدائش کے سلسلے میں غالب اکیڈمی نے ایک پروقار تقریب کا اہتمام کیا تھا اور مجھ سے یہ خواہش کی گئی تھی کہ

Marfat.com

اِس موقع پر میں نظم یا نثر میں مرزا غالب کو خراجِ عقیدت پیش کروں۔

تقریب کا وقت ساڑھے پانچ بجے شام تھا۔ پہلے مزار غالب پر گل پوشی اور چراغاں کیا گیا اور چھ بجے کے بعد محفل مذاکرہ کا آغاز ہوا۔ ڈاکٹر اے۔ ایم خسرو ممبر پلاننگ کمیشن حکومتِ ہند صدر محفل تھے جبکہ حکیم محمد سعید صاحب چیئرمین ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان کو تقریب کا افتتاح کرنا تھا۔ حکیم صاحب عالمی قرآن کانفرنس میں شرکت کیلئے دہلی گئے ہوئے تھے جس کا اہتمام اُن کے بڑے بھائی عبدالحمید نے کیا تھا۔ ان کی آمد سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ تقریب ۱۹ر دسمبر کو کرلی گئی تھی حالانکہ مرزا غالب کا یومِ پیدائش ۱۹ر دسمبر کی بجائے ۲۷ر دسمبر ہے لیکن حکیم صاحب کو واپس پاکستان آنا تھا اسلئے انکی موجودگی میں ہی یہ تقریب کرلی گئی۔

غالب اکیڈمی کے سیکرٹری ذہین نقوی صاحب نے مجھ سے بھی کہا تھا کہ چونکہ آپ ۲۰ر دسمبر کو واپس چلے جائیں گے اسلئے ہم نے یہ تقریب ۱۹ر دسمبر کو ہی رکھ لی ہے تاکہ آپ بھی اس میں شرکت کرسکیں۔

اس تقریب میں جن حضرات نے تقریریں کیں ان میں مالک رام، ڈاکٹر نثار احمد فاروقی، مرزا اشرف الدین ایڈیٹر "اردو گا" تاشقند اور صادقین محمد کے علاوہ راقم الحروف بھی شامل تھا۔ میں نے اس موقع کیلئے چند رباعیات لکھی تھیں جو میں نے پیش کیں۔ سب سے پہلے یہ رباعی پڑھی

تقدیر جو روٹھی ہے تو ہم چھوٹے ہیں ۔ رشتے کہیں الفت کے یونہی ٹوٹے ہیں
اے میرزا غالب کے وطن کے لوگو! ۔ ہم بھی تو اسی باغ کے گل بوٹے ہیں

اس پر کافی داد ملی۔ پھر میں نے غالب کے حضور یوں چراغِ عقیدت پیش کیا۔

آباد نہ ہو کیسے وطن اردو کا ! ۔ شیدا ہے ہر اک صاحب فن اردو کا
خوش رنگ خیالات کے پھولوں سے شہاب ۔ غالب نے سجایا ہے چمن اردو کا

Marfat.com

اُردو کو دیا رنگ عجیب غالب نے — واکر دیئے درِ علم کے سب غالب نے
رعنائی و زیبائی سخن کو دے کر — محکم کیا ایوانِ ادب غالب نے

میں نے یہ رباعیات سنانے سے پہلے کہا تھا کہ

"یوں تو کون ہوگا جو غالب کا ثنا خواں نہ ہو لیکن میں اس حوالے سے ان کو خراجِ عقیدت پیش کر رہا ہوں کہ میرا اُس خانوادے سے تعلق ہے جسے مرزا غالب سے نسبت تلمذ حاصل بھی ہے یعنی میرے رشتے کے دادا حکیم سید محمد ذکریا ذکی مرزا غالب کے بڑے محبوب شاگرد تھے اور ان کے دیوان پر تقریظ بھی مرزا غالب نے لکھی تھی یہ دیوان میرے حقیقی دادا سید میر حسن رضوی نے اپنے مطبع رضوی دہلی سے شائع کیا تھا۔"

یہ سُن کر مالک رام صاحب بطورِ خاص چونکے اور مسرت آگیں لہجے میں بولے "اچھا ذکی صاحب آپ کے دادا تھے۔ میں جب گفتگو ختم کر کے اور رباعیات سُنا کر مالک رام صاحب کے پاس آکر بیٹھا تو وہ اس رشتے کی تفصیلات پوچھنے لگے۔ میں نے بتایا میرے دادا اور حکیم محمد ذکریا ذکی ہم جد تھے۔ ان کے حقیقی پوتے سید زبیر حسن رضوی کراچی میں رہتے ہیں۔ آپ مزید تفصیلات اِن سے حاصل کر سکتے ہیں۔ میں ان کا پتہ واپس پاکستان جا کر آپ کو بھیج دوں گا۔ دراصل مالک رام صاحب نے غالب کے تلامذہ کا تذکرہ مرتب کیا تھا جس پر اب نظرِ ثانی کر کے دوبارہ چھپوا رہے ہیں۔ ذکی صاحب کے متعلق انہیں اسی وجہ سے تجسس تھا۔ بہر حال میں نے واپس آکر بھائی زبیر صاحب کا پتہ انہیں بھجوا دیا ہے تاکہ وہ ان سے براہِ راست خط و کتابت کر سکیں

مجلسِ مذاکرہ میں جن حضرات نے تقریریں کیں وہ توقع کے خلاف زیادہ زور دار نہیں تھیں۔ غالب نے اُردو شاعری کو جو آہنگ دیا ہے اس پر کسی نے گفتگو نہیں کی۔ ان کی شخصیت کے خاص پہلوؤں کو بھی کسی نے اُجاگر نہیں کیا۔ حکیم

Marfat.com

سعید صاحب کسرِ نفسی سے کام لیتے رہے۔ اُن کا کہنا تھا کہ غالب جیسے عظیم شاعر کی تقریبِ یومِ پیدائش کا افتتاح کسی بڑی ادبی شخصیت سے کرانا چاہیے تھا لیکن میری دانست میں جو حضرات وہاں موجود تھے ان میں انکی شخصیت بھی علمی و ادبی لحاظ سے کسی طرح کم حیثیت نہ تھی۔ خسرو صاحب حالانکہ منصوبہ بندی اور حساب کتاب کے آدمی ہیں لیکن انکی صدارتی تقریر میں ادب کی چاشنی بھی تھی اور کلامِ غالب کے مطالعہ کی جھلک بھی۔

مجلسِ مذاکرہ کے بعد محفلِ موسیقی جمی جس میں کئی اچھے گلوکاروں نے کلامِ غالب سے سامعین کو محظوظ کیا۔ میں کچھ دیر اس محفل سے لطف اندوز ہونے کے بعد حکیم عبدالحمید صاحب سے اجازت لیکر لال محل میں آگیا۔

دلی سے واپسی:

اب واپسی کا سہم سوار تھا۔ آج رات کے کھانے کی دعوت رضا صاحب فرسٹ سیکرٹری کویت ایمبیسی کے ہاں تھی۔ چنانچہ علامہ اخلاق اور حکیم سید حسین صاحب کے ساتھ میں وہاں پہنچا۔ یہ نظام الدین میں ہی رہتے ہیں اور بڑے خلیق و ملنسار ہیں اور صاحبِ علم و فضل ہونے کے باوجود عجز و انکسار سے پیش آتے ہیں۔ ان کے ہاں بہت لذیذ کھانا کھایا اور کھانے پر بڑی پر تکلف گفتگو رہی۔ رضا صاحب کے ہم زلف اکبر علی خاں صاحب عرشی زادہ بھی کھانے میں ہمارے ساتھ شریک تھے۔ یہ اپنے والد کی جگہ آج کل رضا لائبریری رامپور سے وابستہ ہیں اور مختلف اداروں سے چھپنے والی کتابوں کے متعلق انہیں اچھی خاصی معلومات حاصل ہیں۔ ان حضرات کی باتوں میں ایسا دل لگا ہوا تھا کہ اٹھنے کو جی نہیں چاہتا تھا لیکن اب رات کافی ہو چکی تھی۔ اسلئے بادلِ نخواستہ ہم اُن سے اجازت طلب ہوئے۔ واپس آکر سونے کیلئے پلنگ پر لیٹا تو کل دلی سے رخصت

Marfat.com

کا خیال کرکے آنکھوں سے نیند اڑ گئی اور دیر تک پلنگ پر کروٹیں بدلتا رہا۔

صبح اُٹھ کر اپنا سامان سمیٹا۔ سوٹ کیس درست کیا۔ اسکے بعد ناشتے سے فارغ ہوا تھا کہ رخصتی ملاقات کیلئے احباب کی آمد شروع ہو گئی۔ ڈھائی بجے انڈین ایئرویز سے لاہور جانے کیلئے ایک بجے پالم کے ہوائی مستقر پر پہنچنا تھا اور اس بات چیت میں بارہ بج چکے تھے اسلئے میں نے ٹیکسی لانے کیلئے کہا۔ پروفیسر ابرار صدیقی کرنپوری نے یہ تکلیف کی اور فوراً ٹیکسی لے آئے۔ میں سب سے بغلگیر ہوا۔ علامہ صاحب نے خاص طور پر مجھے گلے لگا کر خدا حافظ کہا۔ میں اور حکیم صاحب ٹیکسی میں بیٹھے ہی تھے کہ میرے بمبئی والے دوست سعید صاحب مٹھائی کا ایک ڈبہ لیکر بھاگے بھاگے آئے اور ڈبہ میرے ہاتھ میں تھما کر بولے یہ آپ کے پسند کی چیز ہے۔ یہ گاجر کا حلوہ تھا جس سے سعید صاحب اکثر میری تواضع کیا کرتے تھے۔ میں ان کا شکریہ ادا کر رہا تھا کہ ٹیکسی چل پڑی۔ حکیم سید حسین میرے ساتھ پالم کے ہوائی اڈے تک آئے اور روانگی کے تمام مراحل تک وہیں رہے۔ آخر جب سیکورٹی کی چیکنگ کا وقت آیا تو میں نے ان سے کہا کہ اب میں آپ کے ساتھ نہ رہ سکوں گا۔ لہذا یہیں سے الوداع کہہ دیجئے چنانچہ ہم گلے ملے تو ہم دونوں کی آنکھیں اس وقت پُرنم تھیں۔ بہرحال اس کے بعد حکیم صاحب پالم کے ہوائی اڈے سے باہر چلے گئے اور میں سیکورٹی چیکنگ کیلئے ہوائی اڈے کے مخصوص حصے میں داخل ہوا۔ تھوڑی دیر بعد یہ مرحلہ بھی طے ہوا۔ اور میں حسرت بھری نگاہ دہلی پر ڈالتے ہوئے ہوائی جہاز میں بیٹھا تھا کہ وہ زمین سے اڑا اور آن کی آن میں لاہور پہنچ گیا۔ لاہور کے ہوائی اڈے پر عزیزی منصور الرحمٰن، رشیدہ و دراحیلہ سلمہما اور برخوردار زاہد ہاتھ ہلاتے ہوئے دکھائی دیے۔ ہوائی اڈے سے باہر آیا تو زاہد کے دوست اور سائیں نذیر فریدی بھی مجھے لینے آئے ہوئے تھے۔ میں یہاں سے اسٹیٹ بینک کی گاڑی میں بیٹھ کر گلبرگ آیا۔ دوسرا

Marfat.com

سارا دن لاہور میں گذرا اور ۲۲ دسمبر کو تیزگام سے روانہ ہوکر رات کو بہاولپور آگیا۔

اب دہلی میں اپنا جانا اور بیس دن وہاں رہنا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

Marfat.com

بہاولپور سے بخش خاں

سلسلہ عالیہ اویسیہ کے گوہر شب چراغ حضرت خواجہ حافظ عبدالخالق اویسی رحمۃ اللہ علیہ جن کا عُرس ۲۵ - ۲۶ ذی الحج کو ہر سال بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔ علاقہ شہر فرید کی ایک بستی میں آرام فرما ہیں۔ یہ بستی ریلوے اسٹیشن بخش خاں سے جو حاصل پور اور چشتیاں کے درمیان ہے شمال کی جانب تقریباً تین میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ عُرس کے دنوں میں یہاں میلے کا سماں ہوتا ہے۔ وابستگانِ سلسلۂ عالیہ دُور دُور سے کشاں کشاں یہاں آتے ہیں اور عقیدت کے پھول مزار مبارک پر نچھاور کرتے ہیں۔ دو دِن تک بڑی چہل پہل اور رونق ہوتی ہے۔

اس عرس میں شرکت کا مجھے بھی مدّت سے اشتیاق تھا لیکن ہر دفعہ کچھ ایسے مواقع پیش آتے رہے کہ حاضری کی سعادت سے محروم رہا۔ اب کے خدا بھلا کرے حضرت مولانا حافظ محمد فیض احمد اویسی کا جنکی بدولت برسوں کی تمنا پوری ہوئی۔ مولانا صاحب اسی سلسلے سے بیعت کا شرف رکھتے ہیں۔ انہوں نے مجھے دو دِن قبل یہ نوٹس دیدیا تھا کہ میں ۲۵ ذوالحج (ہفتہ) کو دس بجے مسجد سیرانی میں حاضر ہو جاؤں تاکہ وہاں سے انکی معیّت میں بذریعہ بس منزلِ مقصود پر پہنچ سکوں۔

میڈیکل کالج کی مسجد کا مُعائنہ :

وقتِ مقررہ پر میں مسجد سیرانی میں حاضر ہوا تو معلوم ہوا کہ صاحب موصوف زیرِ تعمیر میڈیکل کالج میں ایک مسجد کے انہدام کی تحقیقات

Marfat.com

کیلئے گئے ہوئے ہیں اور مجھے بھی وہاں پہنچنے کی تاکید کر گئے ہیں چنانچہ میں وہاں پہنچ گیا۔ وہاں یہ دیکھ کر سخت افسوس ہوا کہ جو مسجد قدیم الایام سے قائم و آباد چلی آتی تھی اُسے اس طرح ڈھا دیا گیا ہے کہ اب اس کا نام ونشان بھی کہیں نظر نہیں آتا۔ کافی تعداد میں وہاں شہر کے لوگ جمع تھے اور غم و غصہ کا اظہار کر رہے تھے۔ مولانا صاحب نے ان سب کو تسلی دی اور بڑے جذبہ کے ساتھ اس عزم کا اظہار کیا کہ جب تک مسجد دوبارہ اپنے اصل مقام پر تعمیر نہیں ہو جائیگی ہم چین سے نہیں بیٹھیں گے۔ غضب خدا کا مسلمانوں کے ملک میں مسجدوں کا یہ حشر ؟

خیر وہاں سے فارغ ہو کر ہم نے بسوں کے اڈے کا رُخ کیا۔ حاصلپور جانے والی ایک بس تیار کھڑی تھی۔ اس میں سوار ہو گئے۔ مولانا صاحب کے ساتھ میرے علاوہ ان کے فرزند ارجمند اور ایک نعت خواں بھی تھے۔ بس تقریباً ایک گھنٹہ میں قائم پور پہنچ گئی۔ قائم پور سے ہمیں بس چھوڑ کر تانگہ میں سوار ہونا تھا کیونکہ یہاں سے چھ میل کے فاصلہ پر بستی شاہ پور واقع ہے جہاں درگاہ حضرت خواجہ عبدالخالق اویسی علیہ الرحمتہ کے سجادہ نشین حضرت خواجہ صالح احمد اویسی صاحب کے برادرِ خورد حضرت خواجہ محمد سلطان بالا دین صاحب رہائش رکھتے ہیں اور جو عرس کی تقریبات مقررہ تاریخ سے ایک دن قبل اپنے ہاں منعقد کرتے ہیں۔ جناب موصوف خود بھی صاحب ارشاد و ہدایت ہیں اور آپ کے ارادتمندوں کا سلسلہ کافی وسیع ہے۔

شاہ پور کا سفر :

جب ہم شاہ پور کیلئے روانہ ہوئے تو ہم نے دیکھا کہ اس منزل کے راہی ہم ہی نہیں بلکہ قطار اندر قطار لوگ اس طرف چلے جا رہے ہیں۔ تانگے بھی آگے پیچھے کئی تھے جس تانگہ پر ہم بیٹھے تھے وہ یوں تو بہت نفیس اور سُبک رفتار تھا لیکن ناہموار راستے کی وجہ سے قدم قدم پر ہچکولے کھا رہا تھا اور ....

Marfat.com

ہمیں بار بار سنبھل کے بیٹھنا پڑتا تھا۔ تعجب ہے کہ یہ چھ میل کی سڑک جس کے دونوں جانب آخر تک آباد بستیاں ہیں۔ زبانِ حال سے اپنی درماندگی و خستگی کا افسانہ سُنا رہی ہے اور حکام متعلقہ ہیں کہ اِن کے کانوں تک اُسکی آواز پہنچتی ہی نہیں شاید انہوں نے جان بُوجھ کر اس طرف سے کان بند رکھے ہیں۔ اللہ اُن کے دِل کو موم کرے اور وُہ اس ٹوٹی پھوٹی سڑک کو دوبارہ بنانے کی طرف متوجہ ہوں۔

بہرحال ہم افتاں وخیزاں شاہ پور پہنچے۔ یہاں شادی کی سی بہار تھی شامیانے لگے ہوئے تھے۔ دیگیں چڑھی ہوئی تھیں خدام آنے والوں کی آؤ بھگت میں مصروف تھے۔ ہمیں بھی ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ نماز کے وقت حضرت سُلطان دالا دین صاحب اپنے کمرے سے برآمد ہوئے اور سیدھے مسجد کی طرف گئے۔ وہ پانچوں وقت کی نماز خود پڑھاتے ہیں۔ نماز سے فراغت کیبعد ارادتمندوں سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ ہم نے بھی اسی ہجوم میں شرفِ نیاز حاصل کیا۔ اور التفاتِ خاص کے مستحق گردانے گئے۔

ختم کی محفل: مغرب کی نماز کے بعد ختم ہونا تھا۔ حضرت صاحب کی کوٹھی کے برآمدے میں اور اُسکے وسیع و عریض چبوترے پر جہاں دریاں بچھی ہوئی تھیں عقیدتمندوں کا ٹھٹھ کا ٹھٹ لگا ہوا تھا۔ حضرت علامہ شاہ احمد سعید کاظمیؒ بھی ختم میں شرکت کیلئے تشریف لائے ہوئے تھے۔ ختم کیبعد صاحبِ موصوف نے موقع کی مناسبت سے بڑی دِلنشیں اور اثر انگیز تقریر کی۔ انکی تقریر کا لب لُباب یہ تھا کہ معرفتِ حق کیلئے محبتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم بہت ضروری ہے۔ اور جس کے دِل میں محبتِ رسول صلے اللہ علیہ وسلم جاگزیں ہو وُہ دنیا کی کسی آلائش میں مبتلا نہیں ہوسکتا۔ حضرت علامہ کاظمیؒ کی تقریر ختم ہوئی تو ہمارے ہمراہی نعت خواں نے چند شعر پڑھنے کی اجازت طلب کی۔ یہ اشعار میں نے ان نعت خواں کی فرمائش پر

Marfat.com

حضرت سلطان بالادین کی مدح میں ارتجالاً دو ہیں کہہ دیئے تھے۔ ان اشعار نے محفل میں سماں باندھ دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے نوٹوں کا ڈھیر حضرت صاحب کے سامنے لگ گیا۔ میرے ایما پر یہ تمام روپے نعت خواں کو ہی دے دیئے گئے۔ اس وقت دو شعر مجھے یاد ہیں جو یہاں درج کرتا ہوں۔

حُبّ نبی کی جس میں ہے خوشبو لبی ہوئی
اس باغ کے نہال ہیں سلطان بالادین
ہر منکرِ شریعت حقّا کے واسطے !
سرتا قدم جلال ہیں سلطان بالادین

بخش خاں کو روانگی :

یہ پُرکیف و پُرسوز محفل رات گئے ختم ہوئی۔ رات ہم نے وہیں گذاری۔ اگلی صبح "بخش خاں" کا عزم تھا۔ مگر شاہ پور سے قائم پور تک کے تکلیف دہ سفر کے خیال سے جسم میں پھریریاں آرہی تھیں ابھی ہم ایک ریڑھے نما تانگہ میں بیٹھ کر وہاں سے رخصت ہوئے تھے کہ حضرت صاحب کے صاحبزادے کار لیکر آگئے اور ہمیں بالاصرار کار میں بٹھا کر حاصل پور تک چھوڑ آئے۔ حاصل پور سے "بخش خاں" کا فاصلہ دس میل ہے جو ہم نے بس سے طے کیا۔ یہاں اُترے تو سوئے اتفاق سے کوئی سواری نظر نہ آئی۔ گیارہ بجنے والے تھے اسلئے مولانا فیض احمد صاحب اولیسی پیدل ہی چل پڑے۔ اُن کا خیال تھا کہ ختم گیارہ بجے ہونا ہے۔ اسلئے جس طرح بھی ہو ہمیں گیارہ بجے سے پہلے وہاں پہنچ جانا چاہیئے۔ بخش خاں ریلوے اسٹیشن سے خانقاہ مبارک پور تقریباً تین میل دور ہے اور مجھ جیسے کیلئے تو تین میل بھی بیس میل سے کم نہیں لیکن شوقِ فراواں اور مولانا فیض احمد صاحب کی مشائعیت نے اس سفر کو اتنا آسان کردیا کہ نہ تھکن محسوس ہوئی اور نہ بُعدِ مسافت

Marfat.com

کا پتہ چلا۔ لیکن یہاں پہنچ کر جب یہ معلوم ہوا کہ ختم نو بجے ہی ہوگیا تو بڑا دکھ ہوا۔ بہرکیف ہم آستاں بوسی کیلئے پہلے سیدھے خانقاہ شریف میں گئے۔ وہاں تالاب کے پانی سے وضو کر کے فاتحہ پڑھی۔

خانقاہ، مسجد، تالاب :

خانقاہ شریف کی عمارت بڑی پُروقار ہے۔ نواب بہادل خاں ثالث کے وزیرِ اعظم میاں محمد یعقوب خاں نے اِسکی تعمیر میں حصہ لیا تھا۔ اور مجلس خانہ کی تعمیر کے مصارف خود نواب صاحب نے ادا کئے تھے۔ خانقاہ کے ساتھ ہی ایک عالیشان مسجد ہے جو موجودہ سجّادہ نشین حضرت خواجہ صالح محمد اویسی کے ذوقِ تعمیر کا آئینہ دار ہے۔ وہ شبانہ روز اسی کی نوک پلک دُرست کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔ انہوں نے مسجد کے وسیع و عریض صحن میں ایک خوبصورت تالاب بھی بنوایا ہے جسمیں پانی کی فراہمی کیلئے علیحدہ ٹیوب ویل نصب ہے۔ اس تالاب میں ابھی فوارہ لگنا باقی ہے جس کے بعد مسجد کا حُسن دوبالا ہوجائیگا۔

میاں غلام اویس کا حُسنِ اِنتظام :

فاتحہ کے بعد ہم سجادہ نشین صاحب کے در دولت پر حاضر ہوئے۔ خود سجادہ صاحب تو حج بیت اللہ کیلئے گئے ہوئے تھے۔ یہ اُن کا چوتھا حج ہے مجھے ایک بار بہاولپور میں اُن سے شرفِ نیاز حاصل ہوا تھا۔ بڑے عبادت گذار اور مرتاض بزرگوں میں سے ہیں۔ انکے بڑے فرزند میاں غلام اویس جو میرے دیرینہ کرم فرما اور نہایت مخلص دوست ہیں بڑے تپاک سے ملے۔ اپنے والدِ بزرگوار کی عدم موجودگی میں عُرس کے جُملہ انتظامات کی ذمہ داری انہی کے کندھوں پر تھی۔ جسے انہوں نے بہ حُسن الوجوہ پورا کیا۔ ہزاروں لوگوں کے قیام و طعام کا بندوبست کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ لیکن ہم یہاں آکر میاں غلام اویس صاحب کے حُسنِ انتظام کے قائل ہوگئے۔ انہوں

Marfat.com

نے نہایت سلیقے سے تمام امور انجام دیے۔ اور ہر آنے والے کی نہ صرف دلجوئی کی بلکہ اس کا ہر طرح سے خیال رکھا۔ میاں غلام اویس کے برادرِ خورد میاں شہاب الدین نے بھی بھائی کا ہاتھ بٹایا۔ اور سجّادہ صاحب کے عدم موجودگی کو محسوس نہیں ہونے دیا۔

عید کی سی رونق :

خانقاہ حضرت خواجہ عبدالخالق علیہ الرحمتہ پر زائرین کا ہجوم تھا۔ خانقاہ سے باہر دکانیں لگی ہوئی تھیں۔ جہاں کھانے پینے کی چیزوں کے علاوہ عام ضروریات کا ہر سامان موجود تھا۔ چوڑیاں بیچنے والی عورتوں کا بازار الگ تھا۔ بازار میں بالکل ایسی رونق تھی جیسی عید کے دن ہوا کرتی ہے۔

کیا یہ کرامت نہیں ؟

میں یہ سوچ رہا تھا کہ لبعض لوگ نہ جانے بزرگوں کی کرامات کے کیونکر منکر ہیں حالانکہ محض یہ بات کسی کرامت سے کم نہیں کہ جو بزرگ اپنی زندگی میں فیوض وبرکات کا مرکز تھے وہ دنیا سے پردہ کرنے کے بعد بھی مرجع خلائق ہیں۔ صدیاں گزرنے کے باوجود اُن کے اثرات اب تک جاری ہیں۔ لوگ دور دُور سے دیوانہ وار یہاں آتے ہیں اور آسودگی دلتسکین خاطر کی دولت یہاں سے لیکر واپس جاتے ہیں ۔

صاحبِ عرُس :

حضرت خواجہ عبدالخالق علیہ الرحمتہ دسویں صدی ہجری کے صاحب وجد وحال بزرگ تھے۔ طاؤس یمنی حضرت خواجہ اویس قرنی رحمتہ اللہ علیہ سے آپ نے فیض باطنی حاصل کیا تھا۔ پنجاب کے مشہور صوفی شاعر حضرت بلھے شاہ آپکے ہمدرس تھے۔ تحفتہ الابرار کے مؤلف خزینۃ الاصفیاء کے حوالہ سے لکھتے ہیں ۔

" اوّل آپ باتفاق سید ہے بلھے شاہ قصور دگل شیر محمد برادر خورد بارارہ

Marfat.com

بیعت خدمت میں شیخ عبدالحکیم قادری بمقام تلمنبہ شریف لیگئے بعد مراقبہ گل شیر محمد کو انہوں نے اپنا مرید کرلیا۔ اور بلھے شاہ کو انہوں نے فرمایا کہ تمہارا حصہ پاس شاہ عنایت قادری کے تصور میں ہے اور آپ کو فرمایا کہ نصیب تیرا ایسے شخص سے ہے کہ اس جہانِ فانی سے عالمِ جاودانی میں رونق افروز ہے۔ منتظرِ عنایت رہ کر اپنے گھر میں مشغولِ بعبادتِ الٰہی ہو۔ اور پڑھنے درود مستغاث میں مواظبت رکھو پیر تمہارا خود بخود ظاہر ہو جائیگا۔"

اسی کتاب میں تحریر ہے :

" ایک روز آپ اپنے حجرے میں درودِ مستغاث پڑھ رہے تھے کہ ناگاہ ایک شخص نورانی حجرہ سے نمودار ہوا۔ اور گردوبرو آکر سلام علیک کہا۔ مجرد دیکھنے کے بعد آپ بے ہوش ہوگئے اور تمام دن بے ہوش رہے۔ بعد عزدب ہوش میں آئے پھر عبادت میں مشغول ہوگئے۔ دوسرے روز بھی اسی طرح پھر واقعہ ہوا۔ تیسرے روز شرف یاب زیارت آپ ہوئے تو قدم مبارک پکڑ لئے اور نام دریافت کیا۔ آپ نے اپنا نام خواجہ اویس بن عامر قرنی فرمایا اور کہا میں تمہیں حق سے ملوانے پر مامور ہوا ہوں۔ پس آپ کو بیعت سے سرفراز فرمایا اور ایسی توجہ کی کہ خود رفتہ ہوکر بے ہوش ہوگئے۔ تین روز تک اسی حالتِ سکر میں رہے بعد از سہ روز ندائے سرود بہ تقریب شادی گھر ہمسایہ سے آپ کے کان میں پہنچی۔ اور جنبش میں آئے۔ متعلقانش نے اسی وقت سرود نوا کو حاضر کیا۔ جب سرود شروع ہوا تو وجدِ عظیم لاحق ہوا بعد سماع یک شبانہ روز کے ہوش میں آئے اور فرمایا کہ تم سب مجھ کو مبارک باد دو کہ آج میں نے اپنے محبوب و مطلوب کو پالیا ہے۔"

آپ نے نوے سال کی عمر پائی۔ اور تا حیات عوام و خاص کی ہدایت کا سبب بنے رہے۔ ۱۰۹۵ھ میں آپ کا وصال ہوا۔ پہلے آپ کی خانقاہ محب پور ضلع منٹگمری

Marfat.com

ہیں جو آپ کا اصل وطن ہے، تعمیر کیگئی تھی۔ لیکن طغیانیٔ دریا کے باعث جسد مبارک تحصیل میلسی کی ایک بستی بڈھی میں لایا گیا اور پھر وہاں سے حضرت خواجہ محکم الدین سیرانی علیہ الرحمتہ کے ایماء پر موجودہ مقام پر لاکر دفن کیا گیا۔ آپ کے خلفاء میں خواجہ محکم الدین سیرانی علیہ الرحمتہ کا پایۂ روحانی دنیا میں بہت بلند ہے۔ آپ حضرت خواجہ عبدالخالق صاحب کے عمزاد بھائی بھی تھے۔

مراجعتِ بہاولپور:

بعد دوپہر ہم نے مراجعتِ بہاولپور کا ارادہ کیا تو میاں غلام اویس صاحب مزاحم ہوئے۔ انہوں نے مولانا محمد فیض احمد اویسی صاحب کو تو رخصت کر دیا لیکن مجھے وہیں روک لیا۔ رات کے تقریباً دس بجے تک میں انکی تواضع اور مہمان داری کی زد میں رہا۔ اس عرصہ میں وہ اپنے مریدوں کو بھی رخصت کرتے رہے اور اختتامی انتظامات کا بھی جائزہ لیتے رہے۔ ان کی نیت تو یہ تھی کہ رات میں وہیں گذاروں لیکن میری خاطر وہ اسی رات اپنی کار میں بٹھاکر مجھے بہاولپور پہنچا گئے۔ بخش خاں سے بہاولپور تک کا سفر سوا گھنٹے میں طے ہوگیا۔ اور انکی صحبت میں یہ سوا گھنٹہ پلک جھپکتے گذر گیا۔

Marfat.com

لاہور سے شرق پور تک

اس دفعہ لاہور جاتے ہوئے دو خواہشیں دل میں تھیں۔ ایک جناب حکیم محمد موسیٰ امرتسری سے ملاقات اور دوسرے شرق پور میں شیرِ ربانی میاں شیر محمد شرقپوری رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر حاضری۔ اس غرض کیلئے حکیم اللہ بخش انصاری میرے رہنما بننے پر آمادہ ہو چکے تھے چنانچہ انکی معیت میں دونوں سعادتوں سے بہرہ ور ہونے کا شرف حاصل ہوا

حکیم اللہ بخش انصاری بڑے مخلص اور بے ریا انسان ہیں کتابوں سے انہیں جنون کی حد تک عشق ہے جسکی تلاش و جستجو میں وہ ہر دم رواں دواں رہتے ہیں۔ کوئی شہر قصبہ اور قریہ ایسا نہیں جہاں کی خاک انہوں نے نہ چھانی ہو۔ وہ کوڑے اور ردی کے ڈھیر میں سے بھی ہیرے اور جواہر تلاش کر لاتے ہیں۔ یہ اسی ذوق و طلب کا نتیجہ ہے کہ آج انکا ذاتی کتب خانہ نادر و نایاب کتب سے بھرا ہوا ہے۔ انہوں نے اپنے کتب خانے کی جو تقریباً تیرہ ہزار کتب پر مشتمل ہے کوئی فہرست تو ابھی تک مرتب نہیں کی لیکن انکے حافظہ کا یہ عالم ہے کہ جس کتاب پر آپ انگلی رکھیں وہ اُسکی مکمل تفصیل آپ کو بتا دیں گے۔ ان میں ایک ہزار سے زائد ایسے قلمی نسخے بھی ہیں جو فقہ، حدیث، تاریخ اور سیرت کے موضوعات پر اپنی قدامت کے اعتبار سے بڑے گرانمایہ ہیں۔

حکیم صاحب موصوف کی مجھ ناچیز پر خصوصی نظرِ عنایت ہے۔ مجھ پر اکثر کرم کرتے رہتے ہیں خاص طور پر فراہمئ کتب کے سلسلے میں اس وقت وہ میرے سب سے بڑے محسن ہیں۔

حسنِ اتفاق سے پچھلے ہفتہ جب میں عازمِ لاہور ہوا تو حکیم صاحب بھی اپنے ایک نجی کام کے سلسلے میں لاہور تشریف فرما تھے۔ میں نے لاہور میں انکے قیام کو غنیمت جان کر ان سے

Marfat.com

اپنی دونوں دیرینہ خواہشوں کا اظہار کیا تو وہ رہبری کیلئے فوراً تیار ہو گئے۔ ہماری پہلی منزل جناب حکیم محمد موسیٰ امرتسری کا مطب تھا۔ یہ مطب ریلوے روڈ پر گوالمنڈی کے قریب واقع ہے۔ حکیم صاحب کی رہائش تو باغبان پورہ میں ہے لیکن آپ زیادہ وقت مطب میں ہی گذارتے ہیں جہاں جسمانی مریضوں کے علاوہ روحانی مریضوں کا علاج بھی ہوتا ہے۔

حکیم محمد موسیٰ بالقابہ بڑے مرنجاں مرنج، متواضع اور وسیع القلب واقع ہوئے ہیں علوم دینیہ پر انکی نظر بڑی گہری ہے۔ تصوف و طریقت کے رموز و نکات کوئی ان سے پوچھے۔ بزرگوں کے ملفوظات انہیں ازبر ہیں۔ مسائل و عقائد پر برصغیر پاک و ہند میں چھپنے والی کوئی کتاب مشکل سے ایسی ہو گی جو اُن کی نظر سے نہ گذری ہو۔ کتب کے مآخذ و حوالہ جات کے سلسلے میں وہ چلتی پھرتی انسائیکلو پیڈیا ہیں۔ مشائخ اور پیرانِ طریقت تو اپنی روحانی نسبتوں کی وجہ سے مرجع خلائق ہوتے ہیں۔ حکیم صاحب اپنے علم و فضل کی وجہ سے اہل علم کا مرکز و منبع ہیں جہاں تشنگانِ علم بڑی عقیدت و ارادت سے آتے ہیں حکیم صاحب علم کی پیاس بھی بجھاتے ہیں اور چائے پانی سے آنیوالے کی تواضع بھی کرتے ہیں یہاں آکر علم کا جویا ایک طرح کا سکون پاتا ہے۔ گویا حکیم صاحب کا مطب مطب نہیں اہلِ علم کا تکیہ ہے۔

حکیم صاحب طبعًا خاموش اور گوشہ گیر لوگوں میں سے ہیں۔ نام و نمود سے انہیں دور کا بھی واسطہ نہیں وہ علم کی خدمت بھی محض علمی ذوق کے تحت کرتے ہیں کچھ عرصہ ہوا انکی کوششوں سے لاہور میں مرکزی مجلسِ رضا کے نام سے عظیم الشان ایک علمی ادارے کا قیام عمل میں آیا ہے جس نے فاضل بریلوی حضرت مولانا احمد رضا خاں علیہ الرحمتہ کی علمی کاوشوں کو اہل علم سے روشناس کرانے کا انتظام کیا ہے۔ اس ادارے کی جانب سے اب تک متعدد کتابیں منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ یہ اسی سلسلۂ اشاعت کتب کا نتیجہ ہے کہ فرقہ واری تعصب کی بنا پر جو لوگ حضرت فاضل بریلوی کو درخود

Marfat.com

اعتنا نہیں سمجھتے تھے آج انکے تبحر علمی اور انکے فقہی مقام و مرتبہ کے قائل ہیں۔

حکیم صاحب سے میرا غائبانہ تعارف تو مدت سے تھا لیکن بالمشافہ ملاقات کی سعادت کبھی حاصل نہ ہوئی تھی۔ میں جب حکیم اللہ بخش صاحب انصاری کی معیت میں ان کے مطب میں داخل ہوا تو اجنبیت کے پردے آن واحد میں دور ہو گئے۔ وہ اس طرح محبت اور بے تکلفی سے ملے جیسے انکا میرا جنم جنم کا ساتھ رہا ہو۔ پھر تواضع اور خاطر کا جو سلسلہ شروع ہوا تو ٹھنڈے پانی سے لیکر چائے تک اور کھانے سے لیکر آم تک کے دور چل گئے۔ اور یہ دور ایسے بے ساختہ تھے کہ نہ انہیں اصرار کا موقع ملا اور نہ مجھے اظہار تکلف کی ضرورت پیش آئی۔

حکیم صاحب سے ملاقات کی منزل طے کرکے شرق پور شریف کا رُخ کرنا تھا لیکن حسنِ اتفاق دیکھئے کہ شیرِ ربانی حضرت میاں شیر محمد شرقپوری علیہ الرحمۃ کے سجادہ نشین حضرت صاحبزادہ میاں جمیل احمد شرقپوری وہیں مل گئے۔ یہ حکیم صاحب کے مطب میں پہلے سے فروکش تھے۔ بڑی محبت اور اخلاص سے ملے۔ میں نے جب ان سے شرق پور کی حاضری کی خواہش ظاہر کی تو وہ اسی وقت مجھے ہمراہ لیجانے پر آمادہ ہو گئے۔ مجھے اُس دن لاہور میں کچھ کام تھا اسلئے اگلے دن شرق پور کا جانا ٹھہرا اور یہ طے پایا کہ حکیم اللہ بخش انصاری صاحب کی معیت میں علی الصباح اومنی بس کے ذریعے شرق پور روانہ ہونگے۔

شرق پور جانے والی بسوں کا اڈا ریلوے اسٹیشن کے قریب ہے، نماز فجر کے فوراً بعد ہی ہم بس اڈے پر آ گئے یہاں سے تقریباً پونے چھ بجے بس روانہ ہوئی۔ شرق پور لاہور سے بیس میل کے فاصلے پر واقع ضلع شیخوپورہ کا ایک قدیم شہر ہے لیکن اسے اصل شہرت حضرت شیرِ ربانی کی بدولت حاصل ہوئی ہے۔ لاہور سے شرق پور تک علاقہ بڑا سرسبز و شاداب ہے۔ جب ہم لاہور سے روانہ ہوئے تو ہلکی

Marfat.com

ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ بارش کا یہ سلسلہ تا اختتام جاری رہا۔ موسم کی اس دلکشی۔ راستے کے مناظر کی خوش ادائی اور شرق پور کی حاضری کے شوقِ فراواں نے طبیعت کو شعر گوئی پر آمادہ کردیا۔ شرق پور پہنچتے پہنچتے چھ سات شعر موزوں ہو گئے۔ جو لبعد میں ضبطِ تحریر میں لاکر صاجزادہ میاں جمیل احمد صاحب کی نذر کردیئے گئے۔ جو شعر اِس وقت حافظہ میں محفوظ ہیں یہاں درج کرتا ہوں۔ ؎

دِل میں جب آیا خیال شرق پور	چھایا سرتاپا۔ جمالِ شرق پور
مسکرائی آرزوؤں کی کلی !	جب کیا میں نے سوالِ شرق پور
جاگزیں ہے اولیاءاللہ کا عشق	میرا دِل بھی ہے مثالِ شرق پور
ہوگیا میں قائلِ خلقِ جمیل	اللہ اللہ رے۔ جمالِ شرق پور

شرق پور میں اومنی بس کا اڈا میاں صاحب کے دو لنگر سے بالکل متصل ہے وہاں کسی سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ میاں صاحب پیر خانہ میں رونق افروز ہیں۔ ہم وہیں پہنچ گئے۔ میاں صاحب نے ہاتھوں ہاتھ ہمیں لیا اور دسترخواں پر لا بٹھایا جو پہلے سے وہاں بچھا ہوا تھا۔ میاں جمیل احمد صاحب کی سادگی نے مجھے بہت متاثر کیا۔ اُن میں روایتی سجادہ نشینوں کی کوئی خوبی میں نے نہیں دیکھی۔ حجرہ نما ایک معمولی کمرہ میں فرشی نشست تھی۔ دائیں بائیں کچھ کتابیں اور رسائل و جرائد پڑے ہوئے تھے جو اُن کے علمی ذوق کا پتہ دے رہے تھے۔ ناشتہ سے فارغ ہو کر کچھ دیر حالاتِ حاضرہ پر تبادلۂ خیالات ہوا۔ اُن کی ساری گفتگو میں تصنع نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ ہر بات سے دردِ دل ٹپکتا تھا۔ دراصل انکی وضع قطع، بات چیت اور عادات و خصائل پر ان کے بزرگوں کی بڑی گہری چھاپ ہے۔

صاحبزادہ میاں جمیل احمد صاحب کو تصنیف و تالیف سے بھی بڑا شغف ہے ۱۹۵۵ء سے وہ ماہنامہ "نورِ اسلام" نکال رہے ہیں جو مسلکِ اہلسنت کا نقیب اور

Marfat.com

اور علم وادب اور تصوّف کا نہایت حسین مرقع ہوتا ہے حال ہی میں انہوں نے "مسلکِ مجدّد" کے نام سے حضرت امام ربّانی مجدّد الف ثانی رضی اللہ عنہ، کے عقائد مکتوبات کی روشنی میں مرتب کر کے شائع کیے ہیں۔ اس سے پہلے اسی موضوع پر ایک اور مفصل کتاب "ارشاداتِ مجدّد" شائع کی تھی۔ "خزینۂ معرفت" کے نام سے شیرِ ربانی حضرت میاں شیر محمد شرقپوری قدس سرّہ العزیز کے سوانح حیات اور ملفوظات بھی انہوں ہی نے شائع کیے تھے۔

صاحبزادہ میاں جمیل احمد نے حضرت میاں شیر محمد شرقپوری نقشبندی کے خلیفۂ مجاز حضرت ثانی میاں غلام اللہ رح کے خلف الرشید ہیں سلسلۂ نقشبندیہ کی تعلیمات کو عام کرنے کیلئے انجمن حزب الرسول و دار المبلّغین اور مکتبہ نورِ اسلام قائم کر رکھا ہے جن کے ذریعہ اشاعتِ کتب کا سلسلہ جاری ہے۔

کتُب کے تحائف عطا کرنے کے بعد میاں صاحب ہمیں درگاہ حضرت میاں شیر محمد رح میں لےگئے۔ مزار مبارک پر ایک خولصورت گنبد بنا ہوا ہے جو دُور سے دکھائی دیتا ہے۔ مزار سے پہلے ایک چھوٹی سی مسجد ہے جس کی بنا حضرت میاں صاحب نے اپنی زندگی میں ڈالی تھی۔ درگاہ سے متصل ایک وسیع وعریض سقفی چبوترہ ہے جو عُرس کے دنوں میں زائرین سے کچھاکھچ بھر جاتا ہے۔ عرس میں جو ۲، ۳، ربیع الاوّل کو ہوتا قرآن خوانی ونعت خوانی ہوتی ہے۔ علماء تقریریں بھی کرتے ہیں ایک خاص بات جس کا عرس کے دنوں میں یہاں خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اسٹیج پر کوئی ایسا شخص نہیں بیٹھ سکتا جو داڑھی مُنڈا ہو۔ حضرت میاں صاحب علیہ الرحمتہ زندگی بھر اس سنتِ رسول پر سختی سے عمل کرنے کی تاکید کرتے رہے۔

حضرت میاں شیر محمد قدس سرہٗ ۸۶۵ھ میں جُٹ شاہ مقیم میں پیدا ہوئے تھے علوم قرآن اور عربی فارسی پر دستگاہ رکھتے تھے۔ اعلیٰ درجے کے خوشنویس تھے۔ اس

Marfat.com

فن کو بطور پیشہ اختیار کیا علومِ ظاہری کی تکمیل کے بعد بابا امیرالدین کے دستِ حق پرست پر بیعت کی ۔ اور انکی رہنمائی میں اشغالِ نقشبندیہ کو اپنا کر سلوک کی منازل طے کیں تھوڑے ہی عرصہ میں آپ کی بزرگی اور خوارق کی شہرت دور دور تک پھیل گئی ۔ بڑے بڑے علما و صلحا آپ کے دامن سے وابستہ ہو گئے ۔ شاعرِ مشرق حضرت علامہ اقبال کو بھی آپ سے بیحد عقیدت تھی ۔ اور اکثر آپکی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے ۔ آپ کا وصال ۶۳ برس کی عمر میں ۳ ربیع الاول ۱۳۴۴ھ بمطابق اگست ۱۹۲۵ء ہوا ۔ آپ کے مزار پر فاتحہ پڑھنے کیبعد ہم میاں جمیل احمد کے جلو میں ایک قریبی کھیت میں پہنچے یہاں ایک چھوٹی سی جھونپڑی تھی جس میں تین پلنگ بچھے ہوئے تھے ۔ دوپہر کے بارہ بجے تک ہم یہیں رہے ۔ اس اثنا میں میاں صاحب کے ارادتمند بڑے بڑے تربوز کھیت سے توڑ لائے ۔ ایک ایک تربوز دس دس سیر کا وزن کا ہوگا ۔ نہایت سُرخ اور شیریں تھے ۔ دو بار اُن سے ہماری تواضع کیگئی ۔

بارہ بجے کے بعد ہم واپس پیرخانہ میں آ گئے ۔ کوئی ایک بجے خادم نے کھانے کی خبر دی ۔ پیرخانہ کے قریب ہی میاں صاحب کا مکان ہے ۔ اُسکی بیٹھک میں ہم نے کھانا کھایا ۔ کھانے کیبعد قیلولہ کیلئے میاں صاحب کے ایک مرید اپنے گھر پر لیگئے وہاں سے پھر چار بجے کے قریب ہم پیرخانہ میں آ گئے ۔ چائے پی ۔ اب لاہور واپسی کی اجازت چاہتے تھے کہ میاں صاحب نے فرمایا ان کا ایک مرید بہت دن سے آئس کریم کی دعوت کیلئے اصرار کر رہا تھا ۔ آج انہوں نے اسکی دعوت قبول کر لی ہے ۔ لہذا ہمیں بھی اس دعوت میں شریک ہونا ہے ۔ حقیقتاً یہ صرف آئس کریم کی دعوت نہیں تھی بلکہ رات کے مکمل کھانے کی تھی ۔ جس میں آئس کریم صرف ایک جزو تھا ۔ اس دعوت میں رات کے نو بج گئے ۔ اب جو ہم نے دوبارہ اجازت طلب کی تو میاں صاحب نے کہا اب رات یہیں قیام کریں ۔ ہمارے لئے بستر لگ چکے ہیں ۔ صبح وہ خود

Marfat.com

اپنی کار میں ہمیں لے چلیں گے۔ فارسی کا مقولہ ہے "آمدن بہ ارادت رفتن بہ اجازت" لہٰذا اسی پر عمل کیا گیا۔ اور صبح کا ناشتہ کر کے میاں صاحب کے ہمراہ انکی کار میں لاہور کیلئے روانہ ہو گئے۔ میاں صاحب نے از راہِ کرم میری قیام گاہ واقع سنت نگر تک مجھے پہنچا دیا۔ اُن سے جُدا ہو کر میں دیر تک یہ سوچتا رہا کہ اگر درگاہوں اور خانقاہوں کے سجادہ نشین ایسی ہی زندگی گذارنے لگیں جیسی میاں جمیل احمد کی زندگی ہے تو عوام میں پیرانِ طریقت اور مشائخ عظام کے خلاف جو بدگمانی اور بدعقیدتی کی فضا پائی جاتی ہے وہ خود بخود ختم ہو جائے اور روحانیت کے جو سلسلے ہمارے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں وہ اسلام کی خدمت اور اصلاح اخلاق کا بہترین ذریعہ ثابت ہوں۔

Marfat.com

برکتوں کا سفر

بہاولپور سے ڈیرہ غازیخان تک

ڈیرہ غازیخاں یا کالا پانی:

حلقۂ ملازمین میں ڈیرہ غازیخاں پنجاب کا کالا پانی کہلاتا ہے۔ اور جس کسی کا اس علاقہ میں تبادلہ ہوتا ہے وہ یہ سمجھتا ہے کہ مجھے بطور سزا یہاں بھیجا گیا ہے لیکن وہ یہاں آنے کیبعد اتنا اس جگہ سے مانوس ہو جاتا ہے کہ پھر تبادلہ ہونے پر اس کا دل کڑھتا ہے اور وہ یہاں سے جانے سے یک گونہ تکلیف محسوس کرتا ہے۔

یہ عجیب وغریب خطہ خشک اور بے آب وگیاہ پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے سخت موسمی اثرات کا حامل ہے۔ سردیوں میں سخت سردی اور گرمیوں میں سخت گرمی پڑتی ہے زیرِ زمین پانی اکثر کڑوا ہے۔ بعض علاقوں میں تو صرف بارش کے پانی سے گذارا ہوتا ہے۔ آمدورفت خاصی مشکل ہے۔ آج سے کچھ عرصہ قبل تو مواصلات کا واحد ذریعہ بسیں تھیں۔ اب ریلوے لائن بھی بچھا دی گئی ہے جو ایک طرف ڈیرہ غازیخاں کو پنجاب سے اور دوسری طرف بلوچستان سے ملاتی ہے۔ اس لائن پر ایک پسنجر ٹرین اور ایکسپریس ٹرین چلتی ہے۔ ایکسپریس ٹرین چلتن ایکسپریس کہلاتی ہے۔ یہ لاہور سے کوئٹہ تک جاتی ہے۔ کوئٹہ کے مسافروں کو اس سے کافی سہولت ہو گئی ہے۔ لیکن ڈیرہ غازی خاں والوں کیلئے چلتن ایکسپریس میں سفر کرنا خاصا دقت طلب ہے۔ یہ لاہور سے یہاں رات کو بارہ بجے اور ایک بجے کے درمیان پہنچتی ہے۔ اور لاہور جانے کیلئے تین بجے رات کو یہاں سے چلتی ہے۔ گویا دونوں وقت تکلیف دہ ہیں۔ آتے وقت بھی پریشانی اور جاتے وقت بھی پریشانی۔

اولیاء اللہ کا حصار: اِن دقتوں کے باوجود باہر سے آنے والے لوگوں

Marfat.com

کا یہاں دل لگتا ہے۔ یہاں کے لوگ خوش اخلاق اور ملنسار ہیں۔ وہ بہت جلد پردیسیوں کو اپنا لیتے ہیں اور انہیں بیگانگی کا احساس پیدا نہیں ہونے دیتے محبت یہاں کے لوگوں کا طُرّہ امتیاز ہے۔ انہیں یہ لغمت اولیاء اللہ کی تعلیمات سے حاصل ہوئی ہے جو مختلف اوقات میں دشوار گزار سفر طے کرکے اور موسموں کی سختی کا مقابلہ کرکے یہاں سکونت پذیر ہوئے ہیں۔ ان کے الاپے ہوئے محبت کے نغمات اب بھی فضا میں رس گھول رہے ہیں۔ ان اولیاء اللہ کی خانقاہیں ڈیرہ غازیخاں کے گرداگرد واقع ہیں۔ مضبوط اور ناقابلِ شکست حصار کا کام دیتی ہے ڈیرہ غازیخاں میں ایک طرف حضرت سید عادل پیر محو خواب استراحت ہیں تو دوسری طرف پہاڑوں کے دامن میں حضرت سلیمان سخی سرور ڈیرہ جمائے ہوئے ہیں۔ تونسہ شریف جو ڈیرہ غازیخاں کا مشہور قصبہ ہے حضرت خواجہ سلیمان تونسوی کے تصرفاتِ روحانی سے مالا مال ہے۔ ادھر کوٹ مٹھن میں خواجہ محمد عاقل اور انکی جلیل القدر اولاد جن میں قاضی احمد علی، خواجہ خدا بخش، خواجہ غلام فخرالدین اور خواجہ غلام فرید خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں اور آسودۂ خاک ہیں اور انکی خانقاہیں لوگوں کیلئے روحانی تسکین کا باعث ہیں۔

اولیائے کرام کی سرزمین پر ایک اور ولی کا اضافہ:

اولیائے کرام کی اس سرزمین پر ۱۹۴۷ء میں ایک اور ولی کامل کا اضافہ ہوا۔ یہ کامل ولی درگاہ سکندرالکمالی کیتھل کے سجادہ نشین حضرت میاں علی احمد شاہ گیلانی قادری تھے جو فیوض وبرکات کا ایک انمول خزانہ کیتھل سے اپنے ساتھ لے کر آئے اور اہلِ ڈیرہ غازیخاں پر بے دریغ نچھاور کردیا۔ آپ کا وصال ۲۱ دسمبر ۱۹۶۴ء کو ہوا۔ آپ کے حسین و دلکش مقبرے سے ڈیرہ غازیخاں کا حسن دوبالا ہو گیا ہے۔

حضرت میاں علی احمد شاہ گیلانی کے فرزند ارجمند میاں سید مقبول محی الدین گیلانی

Marfat.com

جو اپنے آباء کی تمام نسبی وحسبی عظمتوں کے امین و وارث ہیں آجکل زیب سجادہ ہیں انہیں اہل علم سے دلی لگاؤ ہے۔ اکثر اوقات مطالعۂ کتب میں صرف کرتے ہیں۔ بزرگان کرام کے ملفوظات اور انکے تذکرے شوق سے پڑھتے ہیں۔ انکی تمنا ہے کہ عوام الناس ان بزرگوں کی تعلیمات کو اپنے لئے مشعلِ راہ بنائیں اور اس مادی دور کی آسودگی کو اولیاء اللہ کے روحانی فیوض سے دور کریں۔

حصولِ برکت کا سفر:

یہی نیک خواہش اور جذبۂ صادق پاکستان نیشنل سنٹر ڈیرہ غازی خاں میں ۷ جون ۱۹۷۶ء کو یوم شاہ کمال کیتھلی منانے کا موجب ہوا۔ اس تقریبِ سعید میں بطور مہمانِ خصوصی شرکت صاحبِ موصوف کی طرف سے راقم الحروف کو دی گئی تھی۔ سید مقبول محی الدین صاحب گیلانی القادری سے میرا نیازمندی کا سلسلہ کافی عرصہ سے قائم ہے۔ ان کے ارشاد کو کیسے رد کیا جاسکتا تھا۔ ویسے بھی بزرگوں کے ذکرِ خیر میں شرکت سے زیادہ اور کیا سعادت ہوسکتی ہے۔ اگر بس میں ہوتا تو سر کے بل چل کر جاتا۔ اور پلکوں سے جھاڑتا ہوا اس راہ کو طے کرتا۔ بہر حال میں اسے برکتوں اور سعادتوں کا سفر سمجھ کر ۶ جون کو خیبر میل سے ملتان پہنچا۔ دوپہر محکمہ تعلقاتِ عامہ ملتان کے اسسٹنٹ ڈائریکٹر برادرِ عزیز میاں طہیر کے ہاں گذاری اور رات کو چلتن ایکسپریس سے ڈیرہ غازیخاں کیلئے روانہ ہوگیا۔ ملتان سے چلتن ایکسپریس کی روانگی کا وقت ۹ بجے ہے لیکن ۹ بجے کی بجائے گاڑی دس بجے آئی۔

ڈیرہ غازیخاں میں آمد اور استقبال:

ملتان سے ڈیرہ غازیخاں کا راستہ تقریباً تین گھنٹے کا ہے۔ مجھے یہ فکر تھی کہ گاڑی بہت غلط وقت پر پہنچے گی۔ میاں صاحب کے آرام میں خلل واقع ہوگا۔ اور ناحق دوسرے لوگوں کو بھی یہ بے وقت کی تکلیف ہوگی۔ لیکن میری حیرت

Marfat.com

کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے ڈیرہ غازیخاں کے پلیٹ فارم پر رات کے تقریباً ڈیڑھ بجے دوسرے احباب کے علاوہ میاں صاحب کو خود بنفس نفیس اپنا منتظر پایا۔ وہ بڑی خندہ پیشانی اور تپاک سے ملے۔ میں نے جب میاں صاحب کی موجودگی پر اظہارِ شرمساری کیا تو میاں صاحب کہنے لگے کہ مہمان کا استقبال کرنا تو عین اسلامی طریقہ ہے اور میں نے اس میں انتہائی راحت محسوس کی ہے۔ منجملہ دیگر احباب کے انفارمیشن آفیسر ڈیرہ غازیخاں مسٹر سمیع بھی اسٹیشن پر تشریف لائے تھے۔ پلیٹ فارم کے باہر گاڑیاں ہماری منتظر تھیں۔ ایک کار میں میاں صاحب کے ساتھ بیٹھ کر میں اُن کے دولت خانہ پر پہنچا۔

رہائش کا انتظام:

گھر کے ساتھ ہی مردانہ حصہ میں مجھے ٹھہرایا گیا۔ اسمیں آسائش کی دوسری چیزوں کے علاوہ کولر بھی فٹ تھا۔ تھوڑی دیر بعد ٹھنڈے دودھ سے میری تواضع کیگئی۔ میاں صاحب رات کے تقریباً ڈھائی بجے تک میرے پاس بیٹھے رہے۔ لطیف بود حکایت دراز تر گفتم کی کیفیت تھی۔ میرا دل چاہتا تھا کہ وہ بیٹھے رہیں اور باتیں ہوتی رہیں لیکن اگلے دِن نیشنل سنٹر کی تقریب تھی۔ اسلیئے میاں صاحب کہنے لگے اب آپ سو جائیں ورنہ کل کی تقریب میں شرکت مشکل ہو جائیگی۔

مُلاقاتیں:

صبح ہوئی تو ملاقاتیوں کی آمد شروع ہو گئی جن میں اکثر میاں صاحب کے مُعتقدین یا مُرید تھے۔ ہر شخص سراپا سپاس دکھائی دے رہا تھا۔ اسی دوران ناشتہ آگیا۔ ناشتہ سے فارغ ہوئے تھے کہ ڈیرہ غازیخاں کے اخبار نویس تشریف لے آئے کچھ دیر اُن سے گپ شپ ہوئی۔ انہوں نے شام کو پریس کلب میں آنے کی دعوت دی تاکہ باہمی دلچسپی کے امور پر تبادلۂ خیال کیا جا سکے۔

Marfat.com

نیشنل سنٹر کی تقریب :

دس بجے نیشنل سنٹر کیلئے روانہ ہوئے۔ نیشنل سنٹر کے ریذیڈنٹ ڈائریکٹر مسٹر شریف اشرف انتہائی خلیق اور مرنجاں مرنج واقع ہوئے ہیں۔ انکی ذاتی کوشش سے ڈیرہ غازیخاں کا نیشنل سنٹر بعض شاندار تقاریب منعقد کرنے میں کامیاب رہا ہے۔ نیشنل سنٹر کا دفتر بھی بڑا شاندار ہے۔ شاید پنجاب میں کسی نیشنل سنٹر کو اتنی شاندار عمارت دفتر کیلئے حاصل نہیں۔ سُنا ہے کہ اب حکومت نے اس کا درجہ گھٹا دیا ہے اور مسٹر شریف اشرف جو گریڈ ۱۷ کے نیشنل سنٹر کے ڈائریکٹر تھے۔ اب یہاں سے تبدیل ہو جائیں گے۔ نہ معلوم ڈیرہ غازیخاں والے انکی جدائی کیسے گوارا کریں گے۔

آج کی تقریب کے اہتمام سے مسٹر شریف اشرف کی خوش سلیقی کا پتہ چلتا تھا۔ سامعین کی تعداد بھی نیشنل سنٹر کے روایتی حاضرین کے برعکس کافی تھی۔ اس میں شاید میاں مقبول محی الدین کی شخصیت کو بھی دخل تھا چونکہ ان کے مورثِ اعلیٰ حضرت شاہ کمال کیتھلی کی یاد میں جلسہ منعقد ہو رہا تھا۔ اور اس جلسہ کی صدارت کے فرائض بھی انہیں کو انجام دینے تھے۔ اس لئے قدرتی طور پر ان کے معتقدین کا پورا حلقہ یہاں اُمنڈ آیا تھا۔

جلسہ پر روحانیت کا اثر :

جلسہ کی کارروائی شروع ہونے سے پہلے مسٹر شریف اشرف نے جو خود جلسہ کو کنڈکٹ کر رہے تھے۔ سید مقبول محی الدین کو کرسئ صدارت پر فروکش کیا اور راقم الحروف کو بطور مہمانِ خصوصی ان کے پہلو میں بٹھایا۔ تلاوتِ قرآن پاک سے کارروائی کا آغاز ہوا۔ پھر حمد و نعت کے پھولوں کی بارش ہوئی۔ عبدالسلام احسان القادری کی منقبت بڑی وجد آفرین تھی۔ اس کے بعد باری باری مقررین

Marfat.com

نے حضرت شاہ کمال کیتھلی کی زندگی اور انکی اسلامی خدمات پر روشنی ڈالی۔ میں نے بھی مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے شیخ الآفاق حضرت شاہ کمال کیتھلی کی زندگی پر اپنی بساط کے مطابق خراجِ عقیدت پیش کیا۔ میرے لئے یہ ایک بڑا اعزاز تھا کہ میں اس مقدس تقریب میں مہمانِ خصوصی تھا۔ آخر میں صاحب صدارت جناب سید مقبول محی الدین نے صدارتی خطبہ پڑھا۔ ان کے خطبہ کا لبِ لباب یہ تھا کہ حضرت شاہ کمال کی تاریخ ساز شخصیت میں ایک ایسا پیغام موجود ہے جو انسان کے فکری نہاں خانوں میں طلاطم پیدا کر رہا ہے۔ لوگوں کو چاہیے کہ اپنے محسنین کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے ساتھ انکے مشن کو بھی زندہ رکھیں۔

تمام تقریروں کے دوران فضا پر روحانیت کی چادر چھائی ہوئی تھی۔ لوگ ہمہ تن گوش تھے۔ بقول ایک صاحب کے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ محفل میں بزرگوں کی روحوں کا نزول ہو رہا ہے۔ یہ پاک و متبرک محفل دو گھنٹے جاری رہی۔ آخر میں شریف اشرف صاحب نے مہمانوں کی کوکا کولا سے تواضع کی۔

ظہرانہ:

وہاں سے واپسی پر کھانے کا پروگرام تھا۔ میاں صاحب نے شریف اشرف صاحب الفاریشن افسر اور مقامی صحافیوں کو بھی کھانے پر مدعو کیا ہوا تھا۔ کھانا بڑا پر تکلف اور لذیذ تھا۔ میاں صاحب ایک ایک کے آگے مختلف ڈشیں بڑھا رہے تھے اور اصرار کر رہے تھے کہ کچھ اور لیں۔ تواضع ہو تو ایسی ہو۔ کھانے کے بعد آئس کریم پیش ہوئی جو لذیز بھی تھی اور مقدار میں بھی وافر تھی۔

صحافیوں سے تبادلۂ خیالات:

شام کو پریس کلب میں چائے کی دعوت تھی۔ ڈیرہ غازیخاں کے صحافیوں نے پبلک پارک کے ساتھ یہ جگہ میونسپل کمیٹی سے کلب کیلئے حاصل

Marfat.com

کی ہے۔ کلب کی عمارت تین چار کمروں پر مشتمل ہے۔ عمارت کے سامنے ایک بڑا کشادہ لان ہے۔ ساتھ ہی چار دکانیں بھی کلب کی ملکیت ہیں جنکی آمدنی سے کلب کے روزمرہ کے اخراجات پورے ہوتے ہیں۔ کلب کی انتظامیہ نے پرتکلف ماکولات و مشروبات کا انتظام کیا تھا۔ یہاں صحافیوں سے جن امور پر تبادلۂ خیالات ہوا اُن میں سرفہرست ہفت روزہ اخبارات کیلئے سرکاری اشتہارات کا مسئلہ تھا۔ صوبائی حکومت کا رویّہ اُن کے ساتھ بالکل سوتیلی ماں کا سا ہے۔ اِدھر کچھ عرصہ سے مرکزی حکومت نے انہیں نظر انداز کرنے کی جو پالیسی اختیار کی ہے اُس سے جہاں اُنکی معیشت متاثر ہوئی ہے وہاں ذرائع ابلاغ کا یہ موثر ذریعہ بلاوجہ تباہ ہو رہا ہے۔ صحافیوں نے اِن حالات کے پیشِ نظر اپنی تنظیم قائم کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ سب کی یہ رائے تھی کہ اگر بہاولپور ڈویژن اور ملتان ڈویژن کے ہفت روزہ اخبارات کی کوئی مشترکہ تنظیم قائم ہو جائے تو انکی آواز صدا بصحرا ثابت نہیں ہوگی۔

دربارِ قادری میں حاضری:

پریس کلب کی پارٹی کے بعد دربارِ قادری میں حاضری دی۔ یہاں حضرت میاں علی احمد گیلانی محوِ خوابِ استراحت ہیں۔ یہ جدید طرز کے گنبد کا بڑا خوب صورت مقبرہ ہے۔ میاں مقبول محی الدین شام کو یہیں رونق افروز ہوتے ہیں۔ ان کے ہمراہ مزار پر حاضری دی اور فاتحہ پڑھی۔ مقبرہ کے ساتھ ہی ایک کشادہ سڑک تعمیر کیگئی ہے جس میں سب حاضرین مجلس نے عشاء کی نماز پڑھی یہاں ایک دینی مدرسہ بھی میاں صاحب نے مقبول المدارس کے نام سے قائم کیا ہے۔ اِسکی مزید توسیع کی تجویز زیرِ غور ہے۔ اُمید ہے کہ اس کے بعد ڈیرہ غازیخاں کا یہ سب سے بڑا دینی مدرسہ بن جائے گا۔

Marfat.com

اگلے روز فورٹ منرو کا پروگرام تھا۔ لیکن چونکہ ملتان کے ڈپٹی مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر لیفٹیننٹ جنرل عظیم خاں کو اسی دن وہاں جرگہ سے خطاب کرنا تھا اور بعض احباب بھی اس سلسلہ میں مصروف تھے۔ اسلئے یہ پروگرام ملتوی کر دیا گیا۔ اس دن میاں صاحب کی صحبت سے زیادہ سے زیادہ مستفیض ہونے کا موقع ملا۔ میاں صاحب نے بعض اپنی خاندانی کتابیں جو مسودوں کی شکل میں ہیں، دکھائیں اور اپنے دادا سید صاحب کا اردو فارسی کلام جو بعض مخطوطات سے نقل کیا گیا ہے، سنایا۔ خانوادہ کمالیہ قادریہ کے جن بزرگوں کے مزارات پنجاب یا دوسرے علاقوں میں ہیں اُن کے متعلق میاں صاحب کی معلومات بڑی دقیع ہیں۔

عزب میں عصرانہ :

شام کو دفتر ہفت روزہ عزب میں عصرانہ تھا۔ یہاں صحافیوں کے علاوہ بعض معززین شہر، انفارمیشن افسر، ریذیڈنٹ ڈائریکٹر نیشنل سنٹر اور پروفیسر محسن حیات بھی تھے۔ لودھی صاحب نے بڑا پُرتکلف اہتمام کیا ہوا تھا اس سے کہیں زیادہ اُن کا خلوص تھا جو ہر پہلو سے آشکارا تھا۔

شعری نشست :

رات کو ۹ بجے دربارِ قادری میں ایک نشست ہوئی۔ ڈیرہ غازیخاں کے اکثر شعراء باہر گئے ہوئے تھے اسلئے اس نشست میں زیادہ مجھی کو سمع خراشی کرنی پڑی۔ ڈاکٹر علوی صاحب سے بھی ملاقات ہوئی۔ بڑی باغ و بہار شخصیت ہیں۔ ڈیرہ غازیخاں میں ادب و شعر کا بھرم اُن کے دم سے ہی قائم ہے۔ انکی سخن فہمی اور ذوقِ شعر سے میں بہت متاثر ہوا۔

فورٹ منرو کیلئے روانگی اور حضرت سخی سرور کے مزار پر حاضری :

علی الصباح فورٹ منرو کیلئے روانہ ہوئے۔ دو کاروں کا انتظام

Marfat.com

کیا گیا تھا۔ ایک کار میں میاں صاحب کے ہمراہ راقم الحروف اُن کے دو بچے اور مرزا صاحب سوار تھے اور دوسری کار میں میاں صاحب کا تیسرا بچہ، چند خادم اور کھانے پینے کا سامان تھا۔ راستے میں بستی سخی سرور پڑتی ہے۔ اسلئے سب سے پہلے حضرت سخی سرور کے مزار پر حاضری دی۔ یہ بزرگ حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے ہم عصر ہیں۔ اپنے چار یاروں کے ساتھ انہوں نے یہاں سکونت اختیار کر کے اسلام کی تبلیغ کا بیڑہ اٹھایا تھا یہ جگہ خشک پہاڑوں کے دامن میں ہے۔ گرمیوں میں یہاں سخت گرمی پڑتی ہے اندازہ کیجئے کہ بزرگانِ دین صرف اسلام کی لگن میں کیسے کیسے دشوار گذار اور ہمت آزما راستوں کو طے کر کے یہاں آئے ہیں اور انہوں نے کفر و شرک کے اندھیروں میں معرفت حق کی شمع جلائی ہے۔ اسلام کی تبلیغ کرتے ہوئے یہ اپنے چاروں ساتھیوں سمیت شہید کر دیے گئے۔ ان چاروں یاروں کی قبریں بھی حضرت سخی سرور کے مقبرہ کے قریب ایک اونچی پہاڑی پر واقع ہیں۔

یہاں فاتحہ پڑھ کر ہم نے پھر فورٹ منرو کا رُخ کیا۔ بستی سخی سرور سے چند میل کے بعد ہی کوہِ سلیمان کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہ سلسلۂ کوہ بلوچستان تک چلا گیا ہے یہیں سے ایک راستہ کوئٹہ کو جاتا ہے۔ فورٹ منرو کو جانے کیلئے پہاڑوں کو کاٹ کر سڑکیں نکالی گئی ہیں۔ ایک طرف دیو پیکر پہاڑ ہیں تو دوسری جانب گہری کھائیاں ہیں۔ مشاق اور چاق و چوبند ڈرائیور ہی ان راستوں پر گاڑی چلا سکتے ہیں۔ ڈاکٹر رشید مرزا جو اپنی گاڑی خود چلا رہے تھے، بڑے اچھے ڈرائیور ثابت ہوئے۔ انہوں نے بڑی حفاظت اور آرام سے ہمیں منزلِ مقصود پر پہنچا دیا کہتے ہیں کہ یہ پہاڑ کوئٹہ سے قدرے بلند اور مری سے تقریباً ایک ہزار فٹ نیچا ہے۔

فورٹ منرو کی سیر:

یہاں کا موسم نہایت خوشگوار تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی

Marfat.com

تھیں۔ ڈیرہ غازیخاں کی جھلسا دینے والی دھوپ کے بعد یہاں کے سائے میں ایک طرح کا سرور و کیف محسوس ہوا۔ یہاں ٹھہرنے کا انتظام فورٹ منرو کے سول ہسپتال کے ڈاکٹر کے بنگلہ میں کیا گیا تھا۔ یہ ڈاکٹر رشید کے ساتھیوں میں سے تھے۔ انہوں نے پورا بنگلہ ہمارے حوالے کر دیا۔ خادم کھانے پکانے میں مصروف تھے اور ہم فورٹ منرو دیکھنے کیلئے روانہ ہو گئے۔ تقریباً نصف میل کے فاصلہ پر ڈیم بنایا گیا ہے جس سے اس علاقہ کی پانی کی ضرورت پوری کیجاتی ہے۔ یہ بڑی پُرفضا جگہ ہے۔ یہیں پہاڑی پودوں کی نرسری ہے۔ تقریباً ایک گھنٹہ تک یہاں کے حسین نظاروں سے لطف اندوز ہونے کیبعد ہم واپس بنگلہ میں آ گئے۔ اِس عرصہ میں کھانا تیار ہو چکا تھا۔ اور اشتہا بھی پورے شباب پر تھی۔ سب نے خوب ڈٹ کر کھانا کھایا۔

شام کو اس قلعہ کے آثار دیکھے جو انگریزوں نے قبائیلیوں کا مقابلہ کرنے کیلئے بنایا تھا۔ فورٹ منرو اسی قلعہ کا نام تھا جس سے بعد میں پورا علاقہ موسوم ہو گیا۔ میاں صاحب نے وہ پہاڑی بھی دکھائی جہاں اُن کا ارادہ ایک بنگلہ بنوانے کا ہے۔ میں نے کہا کہ اگر مجھے ایسی جگہ دو ماہ رہنے کا موقع مل جائے تو ایک کتاب آسانی سے تصنیف ہو سکتی ہے میاں صاحب نے کہا کہ بنگلہ تعمیر ہونے کیبعد تو یقیناً یہ سہولت حاصل ہو سکے گی۔ یہاں کے دلفریب نظاروں سے متاثر ہو کر چند شعر بے ساختہ میرے لبوں پر آ گئے۔ میاں صاحب نے داد دی اور کہا انہیں قلمبند کر لیا جائے تاکہ یہ تاثراتی اشعار محفوظ ہو جائیں۔ اشعار یہ تھے۔

میرے منظوم تأثرات:

فورٹ منرو میں ہم نے کیا دیکھا — سر بسر جلوۂ خدا دیکھا
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں آتی تھیں — بابِ رحمت کھلا ہوا دیکھا
رگِ ہر سنگ میں کھلے بوٹے — یہ تماشا بھی جا بجا دیکھا

Marfat.com

فلسفی جسطرح ہوں محوِ خیال | یوں پہاڑوں کو سوچتے دیکھا
شوق آمادۂ عمل پایا ! | جذبۂ ہمت آزما دیکھا
نارسائی مفلساں دیکھی ! | منعموں کو رسا بُسا دیکھا
پستیاں تھیں بلندیوں سے سوا | یہ سماں بھی عجیب تھا دیکھا

رہی حسرت نہ دل میں کوئی شہاب
جو نہ دیکھا تھا وہ بھی جا دیکھا

رات بھیگنی شروع ہوگئی تھی۔ خنکی میں اضافہ ہوچلا تھا۔ کچھ لوگوں نے واپسی کا ارادہ ظاہر کیا تو میں نے کہا کہ اگر چلیں تو اکٹھے چلیں۔ میاں صاحب نے اس تجویز سے اتفاق کیا اور اسطرح رات کو ہی یہ قافلہ ڈیرہ غازیخاں کیلئے روانہ ہوگیا۔ رات کو تقریبًا تین بجے واپس ڈیرہ غازیخاں پہنچے۔ میرا ارادہ اسی دن صبح کو بہاولپور واپس آنے کا تھا لیکن میاں صاحب نے کہا کہ کم از کم آج دن بھر یہاں آرام کریں۔ اور کل تین بجے رات کی ٹرین سے روانہ ہوں۔ اسطرح تھکان بھی دُور ہو جائیگی اور سفر کیلئے تازہ دم بھی ہوجائیں گے۔ میں نے اِس تجویز پر عمل کیا اور اگلے دن تین بجے رات کو میاں صاحب کے حسنِ خلق کا نقش اپنے دل پر لئے براہ مُلتان بہاولپور کو روانہ ہوگیا۔

Marfat.com

رحیم یار خاں کا سفر

خواجہ غلام فرید کالج کے مشاعرے میں شرکت:

راقم الحروف پچھلے دنوں خواجہ فرید کالج رحیم یار خاں کی ایک تقریب میں شرکت کیلئے طلباء کی یونین کی دعوت پر رحیم یار خاں گیا تھا۔ یہ تقریب مشاعرے کی تھی جس میں مختلف کالجوں کے طلبا حصہ لے رہے تھے۔ ان کے درمیان طرحی غزلوں اور مجوزہ موضوع پر نظموں کا مقابلہ تھا۔ مجھے اس مشاعرے میں لبطور مہمان خصوصی مدعو کیا گیا تھا۔ چند اور شعراء کو بھی باہر سے بلایا گیا تھا۔ طلباء کے شعری مقابلہ کیبعد مہمان شعراء کو دعوتِ سخن دی گئی۔ میں نے ایک نظم اور غزل سنائی۔ مشاعرہ رات گئے تک جاری رہا۔ سامعین جن میں طلباء و اساتذہ کے علاوہ صاحب ذوق معززین شہر بھی شامل تھے۔ تمام شعراء کا کلام بڑی دلچسپی سے سنتے رہے آخری شعری مقابلے میں کامیاب ہونے والے طلباء کو میرے ہاتھ سے انعامات دلائے گئے۔ اس موقع پر میں نے کامیاب طلباء کو مبارکباد اور ہارنے والے طلباء کو حوصلہ نہ ہارنے کی تلقین کرتے ہوئے کہا کہ اکثر بزرگ نوجوانوں کو شعر گوئی سے روکتے ہیں اور تضیع اوقات کا سبب قرار دیتے ہیں۔ ان کی یہ بات کسی حد تک ٹھیک بھی ہے جس شوق سے کچھ حاصل نہ ہو اس کیلئے وقت ضائع کرنا بیکار ہے کیونکہ محض چند الفاظ موزوں کر لینے کا نام شاعری نہیں جب تک شعر میں خیال آفرینی نہ ہو۔ زبان و محاورہ کی چاشنی نہ ہو اور جذبات و احساسات کی عکاسی نہ ہو۔ اس وقت تک اس پر شعر کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ اس کیلئے وسیع مطالعہ، واقفیت فن اور محنتِ شاقہ کی ضرورت ہوتی ہے ظاہر ہے کہ یہ منازل بغیر سچی لگن کے

Marfat.com

طے نہیں ہوتیں۔ ہاں جب یہ منازل خوش اسلوبی کے ساتھ طے ہو جاتی ہیں۔ تو حقیقی معنی میں شاعر بن جاتا ہے۔ اور شاعری کا شوق جسے بزرگ ایک عیب سمجھتے ہیں، جب محنت و مشقت کی بدولت اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے تو یہ عیب نہیں رہتا بلکہ ہنر بن جاتا ہے۔ گویا :

"یہ عیب اگر حد سے گذر جائے ہنر ہو"

لہٰذا ان طلباء کو جو شعر گوئی کا شوق رکھتے ہیں میرا مشورہ ہے کہ یا تو اس میں ہنر پیدا کریں یا پھر اسے کارِ بیکاراں سمجھ کر ترک کر دیں۔

پریس کلب میں دوستوں سے ملاقات :

کالج کی اس تقریب سے فارغ ہو کر صبح بہاولپور واپسی کا پروگرام تھا۔ لیکن رحیم یار خاں کے صحافی دوستوں نے جن میں امروز کے نمائندۂ خصوصی بشیر انور پیش پیش تھے، اس دن واپس نہ آنے دیا۔ انہوں نے شام کو پریس کلب میں دوستوں سے گپ شپ کا پروگرام بنایا تھا۔ جہاں صحافیوں کے علاوہ بعض پُرانے رفیقوں سے بھی ملاقات ہو گئی۔ عبدالحمید گوجر جو کبھی مُسلم لیگ کی تنظیمی کمیٹی میں میرے ساتھ رہے تھے بطورِ خاص تشریف لائے تھے۔ ان سے مِلکر تیس سال پہلے کی بہاولپور کی سرگرمیوں کی یاد تازہ ہو گئی اور بے ساختہ میرے لبوں پر یہ شعر آگیا۔

اے دوست کسی ہمدمِ دیرینہ کا ملنا
بہتر ہے ملاقاتِ مسیحا و خضر سے

میں اراکینِ پریس کلب رحیم یار خاں کا انتہائی ممنون ہوں کہ انہوں نے دوستوں سے ملاقات کی یہ صورت نکال کر میرے لئے تسکینِ قلب و رُوح کا سامان پیدا کر دیا۔

ع کرم کردی الٰہی زندہ باشی

اس موقع پر دوستوں نے مجھ ناچیز کے متعلق جن ارفع خیالات کا اظہار کیا

Marfat.com

وہ یقیناً میرے لئے سرمایۂ افتخار ہیں لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ قدرِ ایاز خود لشناس
یہ تو دوستوں کا حسنِ ظن ہے کہ وہ مجھے کسی قابل سمجھتے ہیں ورنہ ؛

من آنم کہ من دانم

اس نشست میں اِن رسمی باتوں کے علاوہ سیاسیاتِ حاضرہ اور ملکی و علاقائی مسائل پر بھی تبادلۂ خیالات کا موقع ملا جس سے رحیم یار خاں کے دوستوں کی سیاسی بصیرت اور قومی درد کا اندازہ ہُوا۔

سیم و تھور کے مسئلے پر چوھدری عبدالحمید گوجر سے گفتگو ؛

کاشتکاروں کی ضلعی تنظیم کے صدر چوہدری عبدالحمید گوجر جو پرانے سیاسی کارکن ہیں اور رحیم یار خاں کی سیاست میں بڑا فعال اور مؤثر کردار ادا کرتے رہے ہیں اس بات سے بہت حراساں تھے کہ پاکستان کی زمین جس تیزی سے سیم اور تھور کی نذر ہوتی جارہی ہیں انکی روک تھام پر اس تیزی سے کام نہیں ہو رہا۔ ان کا کہنا سو فیصدی درست ہے کہ پاکستان کی معیشت کا جن زمینوں پر دار و مدار ہے اگر ان کو برباد ہونے سے نہ بچایا گیا تو خوشحالی و ترقی کی جو شکلیں آج نظر آرہی ہیں وہ کل باقی نہیں رہیں گی۔ اور ملک معاشی لحاظ سے تباہ ہوجائے گا۔ چوہدری عبدالحمید صاحب نے سیم و تھور کی انسدادی کاروائیوں پر بھی عدم اطمینان کا اظہار کیا۔ اُن کا خیال ہے کہ یہ کام واپڈا سے لیکر محکمہ انہار اور محکمہ زراعت کو سونپنا چاہیئے کیونکہ اب تک جو کروڑوں روپے اس غرض کیلئے واپڈا کو دیے گئے، وہ بیکار گئے ہیں۔ رحیم یار خاں کی چند ایکڑ اراضی کو بھی وہ دوبارہ قابلِ کاشت نہیں بنا سکے ہیں۔ یہ محکمہ اپنی کارگذاری کے جو اعداد و شمار پیش کرتا ہے وہ سب بوگس ہیں۔

Marfat.com

چوہدری صاحب نے خدا لگتی بات کی کہ اس وقت ملک میں دھڑا دھڑ ترقیاتی منصوبے بنائے جا رہے ہیں۔ بڑی بڑی سڑکیں اور عالیشان عمارتیں تعمیر ہو رہی ہیں۔ شہروں کی آرائش و زیبائش اور شہریوں کی آسائش و آرام کیلئے بہت کچھ ہو رہا ہے لیکن سوچنے کا مقام ہے کہ اگر ان تمام بنیادی سرگرمیوں کا بنیادی پتھر ہی جو زرعی پیداوار ہے اپنی جگہ سے ہل گیا۔ تو یہ سڑکیں اور عمارتیں اور شہروں کی آسائش و زیبائش کس کام آئے گی۔

چوہدری صاحب نے اسی سلسلے میں سیاستدانوں کی عدم دلچسپی کا بھی شکوہ کیا۔ انہوں نے کہا کہ سیاستدان انتخابات پر تو اٹھتے بیٹھتے زور دیتے رہتے ہیں لیکن سیم اور تھور کی تباہ کاریوں کے انسداد کیلئے اُن کی زبان سے کبھی کوئی لفظ نہیں نکلا حالانکہ انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ انتخابات سے عوام اور کاشتکاروں کو کوئی دلچسپی نہیں۔ اُن کا مسئلہ پیٹ کا ایندھن بھرنا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ زمین اچھی پیداوار دے تاکہ بھوک و افلاس انکے قریب نہ آسکے چنانچہ انہوں نے تجویز پیش کی کہ کچھ عرصہ کیلئے انتخابات اور تمام ترقیاتی منصوبوں کو روک کر جنگی بنیادوں پر سیم اور تھور کا مقابلہ کیا جائے۔ انہوں نے کہا اگر تمام وسائل کو مجتمع کر کے پوری قوم اس کام پر لگ جائے تو ایک سال کے اندر اندر ہ مہینوں کا یہ روگ دُور ہو سکتا ہے۔ اور پھر قوم صحیح معنی میں ترقی و خوشحالی کی راہ پر گامزن ہونے کے قابل ہو سکتی ہے۔"

شاید سیاسی حلقوں کو چوہدری صاحب کی یہ بات اچھی نہ لگے لیکن قابل غور بات یہ ہے کہ اگر کاشتکاروں نے انتخابات کا بائیکاٹ کیا اور وہ کسی سیاست دان کو ووٹ دینے کیلئے تیار نہ ہوئے۔ جسکی دھمکی بھی کاشتکاروں کے نمائندہ کی حیثیت سے چوہدری صاحب نے دی ہے تو پھر صورت حال کیا ہوگی۔

Marfat.com

بہرحال یہ مسئلہ نہ صرف غور طلب بلکہ مؤثر اور فوری تدابیر کا متقاضی ہے اور حکومت اور سیاستدان اس سے عہدہ برآ ہوئے بغیر عوام سے سرخرو نہیں ہو سکتے۔

اس مفید کار آمد گفتگو کے بعد پریس کلب کی نشست برخواست ہوئی اور میں بہت اچھی اور خوشگوار یادوں کو سینے سے لگائے اگلے دن خیبر میل سے واپس آ گیا۔

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

Marfat.com

سیالکوٹ سے لاہور تک

صاحبِ حوصلہ آدمی :

مولوی محمد یوسف عازم القادری بڑے عزم والے اور صاحبِ حوصلہ آدمی ہیں۔ دین کا درد رکھتے ہیں اور بس نہیں چلتا کہ ساری دنیا کو دیندار اور صاحبِ ایمان بنا دیں۔ لوگ اپنے وطن سے باہر اسلئے جاتے ہیں کہ وہاں سے کمائی ہوئی دولت سے اپنا گھر بھریں اور اپنے اہل و عیال کیلئے عیش و راحت کا سامان پیدا کریں لیکن ان کا اس سے بھی مقصد دین کی دولت جمع کر کے آخرت کا سامان فراہم کرنا ہے۔ یہ قطر (عریبین گلف) میں ملازمت کرتے ہیں۔ ملازمت کے علاوہ دوسری محنت و مشقت بھی کرتے ہیں اور اس ساری کفا جفا کے بعد جو کچھ حاصل ہوتا ہے وہ اسلام کی خدمت اور دینِ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و بقا کیلئے خرچ کر دیتے ہیں۔ سال میں دو ماہ کی چھٹی ملتی ہے۔ اور کوئی ہوتا تو یہ دن اپنے بال بچوں میں ہنس بول کر گذارتا لیکن ان کا یہ حال ہے کہ ان دنوں میں بھی یہ ہر سال میلادِ مصطفےٰ کانفرنس کا اہتمام کرتے ہیں جس میں زیادہ سے زیادہ علماء کو دعوت دیتے ہیں اور اسکے جملہ مصارف کا بوجھ بلا منتِ غیرے خود اٹھاتے ہیں۔ اس دفعہ راقم الحروف نے بھی ایسی کانفرنس میں شرکت کا وعدہ کیا تھا چنانچہ حسبِ وعدہ شرکت کی۔ اگر شرکت نہ کرتا تو درویشی میں تونگری اور غربت میں امارت کا نظارہ کرنے سے محروم رہ جاتا۔

سیالکوٹ میں میلادِ مصطفےٰ کانفرنس :

مولوی عازم القادری کا مکان سیالکوٹ کے علاقہ کوٹلی بہرام میں ہے۔ یہیں انہوں نے ایک دینی مدرسہ خادم العلوم کے نام سے جاری کیا ہوا ہے۔ جس کے اخراجات کے یہی کفیل اور ذمہ دار ہیں۔ میلادِ مصطفےٰ کانفرنس بھی یہیں ہوئی

Marfat.com

تھی۔ تین روز کا پروگرام تھا اور نومبر کی ۵،۶،۷ تاریخیں اس غرض کیلئے مقرر تھیں۔ میں نے ۶ نومبر والے اجلاس میں شرکت کا وعدہ کیا تھا خیال تھا کہ شاہین ایکسپریس سے ۵ نومبر کو رات کے وقت بہاول پور سے روانہ ہو کر ۶ نومبر کو دوپہر تک سیالکوٹ پہنچ جاؤں گا۔ لیکن شومئی قسمت سے شاہین میں سیٹ ریزرو نہ ہو سکی اور مجبوراً ایک پسنجر ٹرین کے ذریعہ جانا پڑا جس نے پورے ۲۵ گھنٹے میں تقریباً چھ بجے شام کو سیالکوٹ پہنچایا۔ جو لوگ مجھے اسٹیشن پر لینے آئے تھے وہ مایوس ہو کر واپس چلے گئے تھے۔ میں نے اسٹیشن سے باہر آ کر کوٹلی بہرام کیلئے ٹانگہ کیا جو پوچھتا پچھاتا کوئی ڈیڑھ گھنٹے میں مولوی محمد یوسف صاحب کے درِ دولت پر پہنچا۔ موصوف مہمانوں میں گھرے ہوئے تھے۔ میرا سنتے ہی سب کو چھوڑ چھاڑ کر آئے اور فوراً جذبات میں مجھ سے لپٹ گئے۔ ان کی خوشی دیدنی تھی۔ تواضع میں بچھے جا رہے تھے۔ مجھے علیحدہ ایک کمرہ میں ٹھہرایا۔ کھانے سے فارغ ہو کر میں انکے ہمراہ جلسہ گاہ میں پہنچا جو بجلی کے قمقموں سے بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ حاضرین کی کافی تعداد تھی اسٹیج پر علمائے کرام رونق افروز تھے۔ انہیں کے پہلو میں مجھے بھی بٹھایا گیا تھا۔۔ تقاریر کا آغاز ہوا۔ باہر سے آئے ہوئے مہمان علمائے نے خطاب کیا اور عظمتِ مصطفٰے، مقامِ مصطفٰے اور عشقِ مصطفٰے کے موضوعات پر بصیرت افروز خیالات پیش کئے۔ صاحبزادہ مولانا عطائے مصطفٰے کی تقریر خاص طور پر بڑی دلگداز اور اثرانگیز تھی پورا مجمع مسحور ہو گیا تھا۔ تقریروں کے دوران نعت خوانوں نے بھی آواز کا جادو جگایا اور اپنے پُرسوز اور عشق میں ڈوبے ہوئے کلام سے وجد و کیف کا عالم طاری کر دیا۔ میں نے اس تقریب کیلئے جو نظم لکھی تھی وہ سنائی اور ضرورت سے زیادہ داد پائی۔ جلسہ کا اختتام سلام و قیام پر ہوا جس کے بعد ہم اپنے مستقر پر آ گئے۔

Marfat.com

تونگری کیلئے امارت ضروری نہیں :

مولوی محمد یوسف صاحب نے دورانِ گفتگو بتایا کہ جن صاحب نے جلسے کی صدارت کی تھی وہ بچپن میں انہیں تعلیم کیلئے تین روپے ماہوار ظیفہ دیا کرتے تھے۔ سیالکوٹ کے صاحب ثروت لوگوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ تونگری کا دِل سے کتنا تعلق ہے۔ جلسے میں جب ایک مولوی صاحب نے دینی مدرسے کیلئے لوگوں سے چندے کی اپیل کی تھی تو ان صاحب کی جیب سے بمشکل سو روپے کا نوٹ نکل سکا تھا جبکہ اِن سے کم حیثیت لوگوں نے پانچ پانچ سو روپے بھی بڑی خوشی سے دیدیئے تھے۔ اور دُور کیوں جایئے انہیں مولوی محمد یوسف کو دیکھ لیجئے "گھر پھونک تماشہ دیکھ" کی مثل ان پر صادق آتی ہے۔ جو کچھ قطر سے کما کر لائے تھے وہ اِس جلسہ پر لُٹا دیا اور ہزاروں روپے اپنے ذمّہ قرض بھی کر لئے۔ رات زیادہ بیت چکی تھی۔ ۲۶ گھنٹے لمبے سفر کی تھکان بھی تھی۔ جانے کِس وقت میری آنکھ لگی۔ اور مولوی محمد یوسف کب میرے پاس سے گئے۔ صُبح نماز کے وقت آنکھ کھلی تو دیکھا کہ وہ مہمانوں کیلئے ناشتہ تیار کروانے میں مصروف تھے۔ اس دِن کانفرنس میں جن علمائے کرام کو خطاب کرنا تھا اُن میں مجاہد ملّت مولانا عبدالستار خاں نیازی اور محمد اکبر ساقی بھی شامل تھے۔ لیکن چونکہ مجھے لاہور جانا تھا اِس لئے ان حضرات کی تقاریر سے مستفیذ ہونے میں ناکام رہا۔

لاھور کا عزمِ سفر :

ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہو کر میں نے لاہور کیلئے رختِ سفر باندھا اور اپنے میزبان سے اجازت طلب کی۔ وہ مجھے بس تک چھوڑنے آئے۔ میں انکی دینی خدمات جذبۂ ایثار اور فقیرانہ مزاج سے بیحد متاثر تھا لیکن بس میں بیٹھتے بیٹھتے یہ کہے بغیر نہ رہ سکا کہ بال بچّوں کا بھی آپ پر حق ہے۔ اگر اُنکی طرف سے غفلت یا بے توجہی

Marfat.com

ہوئی تو شاید خدا اور رسول کو خوش کرنے کی یہ تمام مساعی بیکار جائیں۔ انہوں نے اس بات کا جواب تو نہیں دیا لیکن میں نے دیکھا کہ انکی آنکھیں بھادوں کے بادلوں کی طرح برسنے کیلئے تیار ہیں۔ بس چلنے والی تھی۔ میں ان سے گلے مل کر بس میں بیٹھ گیا اور انکا ایک طوفان لئے لاہور کیلئے روانہ ہوگیا۔ سارے راستے یہ سوچتا رہا کہ یہ دُبلا پتلا دھان پان سا آدمی عزم ویقین کے باب میں کس قدر مضبوط اور طاقتور ہے اور دین کی محبت نے اسے کتنا حوصلہ عطا کیا ہے کہ یہ بیوی بچوں کو چھوڑ کر دیارِ غیر میں محنت ومشقت کرنے محض اسلئے جاتا ہے کہ وہاں زیادہ سے زیادہ کمائی کر کے دینی کاموں پر خرچ کر سکے۔ انہوں نے سر چھپانے کیلئے کوٹلی بہرام میں ایک کچا پکا مکان تو ضرور بنا لیا ہے لیکن اسکے کئی گوشے ابھی انکی توجہ کے محتاج ہیں۔ دیکھئے اس کیلئے انہیں کب مہلت ملتی ہے۔

لاھور میں مصروفیات:

لاہور میں میرے منجھلے بیٹے مشہود حسن رضوی پہلے سے آئے ہوئے تھے اور اپنی پھپھی الطاف فاطمہ کے پاس ٹھہرے ہوئے تھے۔ میں عزیزی فضل محمود ٹریفک مجسٹریٹ کے ہاں ٹھہرا۔ میرے چھوٹے بھائی سید ظہیر الحسن رضوی بھی جو حال ہی میں ملتان سے تبدیل ہو کر آئے ہیں اور محکمہ تعلقات عامہ میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر ہیں یہاں قیام پذیر ہیں شام کو مشہود بھی یہیں آ گئے۔ اُن کے ساتھ اگلے دن کیلئے کچھ ملاقاتوں کا پروگرام بنایا۔ اپنے بعض محسنوں، مربیوں اور دوستوں سے ملے ہوئے عرصہ ہو گیا تھا۔ اور دِل چاہتا تھا کہ تھوڑی تھوڑی دیر کیلئے ان سب کے پاس جاؤں۔

بی۔ اے قریشی صاحب سے مُلاقات:

چنانچہ سب سے پہلے جناب بی۔ اے قریشی صاحب سے ملاقات طے ہوئی۔ وہ آجکل پنجاب انڈسٹریل ڈویلپمنٹ بورڈ کے چیئرمین کے علاوہ فیڈرل لینس

Marfat.com

کمیشن کے چیئرمین بھی ہیں۔ انہوں نے کمیشن کے دفتر میں دس بجے صبح ملاقات کا وقت دیا تھا۔ ان کا دفتر ریس کورس روڈ پر زنانہ کلب کے سامنے ہے۔ وہاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ قریشی صاحب کسی میٹنگ میں مصروف ہیں۔ کچھ دیر انتظار کرنا پڑے گا۔ لیکن ابھی چند ہی لمحے گذرے تھے کہ چپراسی آکر مجھے اندر لے گیا۔ قریشی صاحب کسی فائل کا مطالعہ کر رہے تھے۔ میں نے سلام کیا تو مسکرا کر بڑے تپاک سے ملے۔ اور کافی دیر تک میرے احوال معلوم کرتے رہے۔ بہاولپور کی علمی و ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں پر بھی گفتگو کی۔ انہیں فنون لطیفہ اور آثار قدیمہ سے خصوصی دلچسپی ہے۔ بہاولپور کا عجائب گھر انہیں کی خاص توجہ کا نتیجہ ہے۔ اعلیٰ تعلیمی صلاحیتوں کے مالک ہیں ہر کام بڑے انہماک، مستعدی اور دلجمعی سے کرتے ہیں۔ وہ بحیثیت افسر ہی نہیں بحیثیت انسان بھی نہایت شفیق، ہمدرد اور نیک دل ہیں۔ کسی مستحق کی امداد سے گریز نہیں کرتے۔ بہاولپور نے جب سے ڈویژن کی حیثیت اختیار کی ہے یہاں بیسیوں کمشنر آئے جن میں اکثر بڑے قابل اور جید قسم کے تھے لیکن ان میں سے جن کی یاد کے نقوش میرے دل سے کبھی محو نہیں ہونگے ایک بی۔ اے قریشی صاحب بھی ہیں جن سے اگرچہ ۱۹۶۳ء کے بعد اب ۱۹۸۰ء کو دوبارہ موقع ملا تھا لیکن اس سترہ سال کی طویل مدت نے بھی نہ اُن کے طرزِ عمل میں تبدیلی پیدا کی تھی اور نہ انکی محبت و شفقت میں کوئی فرق آیا تھا چنانچہ جس عقیدت اور جذبے سے میں انکے پاس گیا تھا وہ صحیح سلامت واپس لیکر آگیا۔

ڈاکٹر عبدالوحید قریشی کے ہاں شیخ منظور الٰہی بھی مل گئے

بی۔ اے قریشی صاحب کے بعد میں نے اورینٹل کالج کا رُخ کیا جہاں ڈاکٹر عبدالوحید قریشی پرنسپل اورینٹل کالج سے ملنا تھا۔ یہ میرے دیرینہ کرم فرما ہیں ادبیات، اردو اور فارسی میں اعلیٰ مقام کے مالک ہیں۔ بہت سے تخلیقی کارنامے

Marfat.com

انجام دے چکے ہیں۔ ان کی بھرپور علمی شخصیت میرے لئے ہمیشہ وجہ کشش رہی ہے انکے کمرے میں پہنچا تو وہ بڑی گرمجوشی سے بغلگیر ہو کر ملے۔ انکی میز کے گرد کئی پروفیسر بیٹھے ہوئے تھے جن سے ڈاکٹر صاحب نے میرا تعارف کرایا۔ میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر صاحب کے پاس پروفیسروں، طلباء و طالبات اور عام ملاقاتیوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ اور انکا کمال یہ تھا کہ وہ بیک وقت سب کی طرف ملتفت تھے اور مسکراتے مسکراتے سب کو بھگتاتے جاتے تھے اسی دوران مجھ سے بھی گفتگو ہوتی رہی اور میری علمی و ادبی مصروفیات کا حال معلوم کرتے رہے۔ کچھ دیر بعد شاید وہاں کوئی میٹنگ ہونے والی تھی اور ڈاکٹر صاحب اپنی محفل برخواست کرنے کیلئے پہلو بدل رہے تھے۔ میں اس صورت حال کو بھانپ کر ان سے اجازت لے رہا تھا کہ شیخ منظور الٰہی صاحب ایکا ایکی وہاں تشریف لے آئے وہ بھی شاید اسی میٹنگ میں شرکت کیلئے آئے تھے۔ ان سے غیر متوقع ملاقات بڑی خوشی کا باعث ہوئی وہ آجکل فیڈرل پبلک کمیشن کے ممبر ہیں بڑے مرنجاں مرنج، شریف الطبع اور صاف ستھرے اللسان ہیں۔ بہت عمدہ ادبی ذوق رکھتے ہیں بہ نسبت ایک افسر کے انشاء پرداز کی حیثیت سے زیادہ جانے پہچانے جاتے ہیں بہاولپور میں انکی کمشنری کا زمانہ یادگار کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی زمانے میں مری ادبی سرگرمیوں کو صحیح معنوں میں تخلیقی رُخ اختیار کرنے کا موقع ملا جس کیلئے میں ہمیشہ ان کا ممنون رہوں گا تھوڑی دیر ان کے پاس بیٹھ کر وہاں سے رخصت ہوا۔

ماہِ نو اور پاک جمہوریت کے دفتر میں:

ماہ نو و پاک جمہوریت کے دفتر پہنچا جہاں فضل قدیر صاحب سے ملاقات کی یہ ایک رشتے سے میرے بھائی ہیں۔ بہت اچھے ادیب ہیں۔ انکی تحریریں بڑی جاندار و دقیع ہوتی ہیں کئی سال ماہ نو کے ایڈیٹر رہے۔ اس زمانے میں ماہِ نو کے جو خاص نمبر نکلے انہیں ادبی حلقوں میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ آجکل پاک جمہوریت

Marfat.com

کی ادارت ان کے سپرد ہے اور اس میں رنگ و نور بھرنے کی دھن میں لگے ہوئے ہیں۔ یہیں ماہِ نو کے ایڈیٹر سے بھی ملاقات ہو گئی۔ انہوں نے ماہِ نو کا ایک تازہ شمارہ جو مسلم فنِ تعمیر کے موضوع پر مرتب کیا گیا تھا مجھے عنایت کیا۔ اس نمبر کے مطالعہ سے ایڈیٹر صاحب کی وسعتِ نظر کا اندازہ ہوا۔ کافی دیر گپ شپ کرنے کے بعد ڈھائی بجے فضل قدیر صاحب اپنے دفتر سے اٹھے تو ایک ریستوران میں آ بیٹھے۔ وہاں گرم چائے کے ساتھ بہت سے گرم گرم موضوعات زیرِ بحث آئے۔

الطاف فاطمہ ایک محبت کرنے والی بہن:

وہاں سے بہن الطاف فاطمہ کے گھر پہنچا اور ناخواندہ مہمان بن کر بے وقت انہیں کھانا کھلانے کی دعوت دی۔ یہ بہت محبت کرنے والی بہن ہیں۔ چاہے برسوں بعد ان سے ملنا ہو لیکن جب ملتی ہیں تو اپنائیت و یگانگت کی مکمل تصویر دکھائی دیتی ہیں۔ ماشاءاللہ ادبی دنیا میں انہوں نے بہت نام پیدا کیا ہے جدید افسانہ نگاروں میں ان کا شمار صف اول میں ہوتا ہے۔ ایک دو ناول بھی چھپ کر ادبی دنیا سے خراجِ تحسین وصول کر چکے ہیں۔ آجکل بھی ایک ناول کی تیاری میں مصروف ہیں۔ کالج کی لیکچراری سے فارغ ہو کر گھر کا سارا کام کاج یہانتک کہ کھانا پکانا بھی اپنے ہاتھ سے کرتی ہیں۔ بھتیجے بھانجوں کی دیکھ بھال انہیں اسکول لیجانا اور اسکول سے وقت پر لانا بھی انکے ذمہ ہے۔ اتنے ڈھیر سارے کاموں کے بعد وہ لکھنے لکھانے کیلئے بھی وقت نکال لیتی ہیں۔ اللہ انہیں نظرِ بد سے بچائے اور ان کا یہ ذوق و شوق اور ہمت و حوصلہ اسی طرح قائم دائم رہے۔

شام کو بہادلپور ہاؤس پہنچا تو عزیزی فضل محمود اور برادرم ظہیر حسن رضوی کو اپنا منتظر پایا۔ رات گئے تک ان کے ساتھ باتیں ہوتی رہیں۔ اگلے دن سیکرٹریٹ سے متعلق دو تین کام تھے چنانچہ زیادہ وقت وہیں گذرا۔ کہیں اور جانے کا پروگرام نہ بن سکا۔

Marfat.com

نعیم معین الدین قادری کی محفل :

البتہ شام کے وقت فضل محمود نے نعیم معین الدین قادری صاحب کے ہاں چلنے کو کہا یہ صاحب جسٹس شمیم الحسن قادری چیف جسٹس پنجاب ہائی کورٹ کے چھوٹے بھائی ہیں۔ بڑے خوش عقیدہ، صاحب ذوق اور نیک دل انسان ہیں۔ بزرگانِ دین خصوصاً اولیائے کرام سے دلی وابستگی رکھتے ہیں۔ سلطان الہند حضرت خواجہ غریب نواز کے عاشق ہیں۔ وہ بھی اُن پر خاص نظرِ کرم رکھتے ہیں اور روحانی فیوض سے نوازتے ہیں ہر وقت انہیں کا کلمہ پڑھتے ہیں۔ ان پر کئی سال تک بلاناغہ محفلِ سماع منعقد کراتے رہے۔ اب بھی روزانہ بزمِ احباب منعقد ہوتی ہے۔ حضور غریب نواز کی باتیں ہوتی ہیں اور انکی فاتحہ دلا کردہ کھانا خود بھی کھاتے ہیں اور حاضرینِ بزم کو بھی کھلاتے ہیں۔ مجھ سے ملکر بہت خوش ہوئے۔ آجکل ذکرِ حسین کا اہتمام کر رکھا ہے۔ سات بجے شام سے آٹھ بجے تک یہ مجلس برپا ہوتی ہے جس میں ایک مولوی صاحب امام حسین علیہ السلام کی سیرت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ مجھ سے بھی اس مجلس میں سلام پڑھنے کی فرمائش کیگئی جسے میں نے انکی پاس خاطر سے منظور کر لیا چنانچہ اگلے دن پونے سات بجے انکی کار مجھے بہاولپور ہاؤس لینے آگئی۔ پروگرام کے مطابق میں نے سلام پیش کیا اور مولوی صاحب نے جو مولانا فاضل مقبل صاحب دہلوی کے فرزند ارجمند ہیں تقریر کی۔ پھر دسترخوان بچھا۔ خاصا پر تکلف کھانا تھا۔ سب نے ملکر کھایا۔ اس کے بعد چائے کا دور چلا اور تقریباً دس بجے تک اولیاء اللہ کی باتیں اور انکے فیوض و کرامات کا تذکرہ ہوتا رہا۔ اگلے دن کیلئے قادری صاحب نے مجھ سے پھر حاضر ہونے کا وعدہ لیا تھا اور حسبِ سابق انکی کار بھی مجھے لینے کیلئے بہاولپور ہاؤس آگئی تھی۔ لیکن افسوس ہے کہ میں ایک جگہ ایسا پھنسا تھا کہ وہاں سے کافی دیر کے بعد گھر پہنچا اور اسطرح اس نیک محفل میں دوبارہ شرکت سے محروم رہا۔

Marfat.com

جناب اے۔ کے خالد سے ملاقات:

اگلے دن جناب اے کے خالد ممبر بورڈ آف ریونیو سے ملنے کا پروگرام تھا۔ ان کے دفتر پہنچا تو وہ عدالتی کارروائی میں مصروف تھے۔ ان کے پی اے نے بتایا کہ ۱۲ بجے تک وہ مقدمات سے فارغ ہو جائیں گے اگر اس وقت چاہیں تو اُن سے ملاقات ہو سکتی ہے چنانچہ میں یہ وقت گذارنے اور ینٹل کالج چلا گیا۔ ڈاکٹر عبدالوحید قریشی صاحب کچھ غیر ملکی سکالروں کے ساتھ مصروف گفتگو تھے۔ کچھ دیر بعد وہ رخصت ہوئے تو ڈاکٹر صاحب ادھر متوجہ ہوئے۔ اور عزیزی مشہود کیلئے پی ایچ۔ ڈی کے ممکنہ موضوعات پر اُن سے تبادلۂ خیالات ہوا۔ ایک بجے کے قریب میں وہاں سے اُٹھ کر پھر بورڈ آف ریونیو کے دفتر پہنچا اس وقت اے کے خالد صاحب نمازِ ظہر ادا فرما رہے تھے۔ نماز سے فارغ ہو کر اپنے دفتر میں آکر بیٹھے تو میں نے اپنی چِٹ اندر بھیجی۔ انہوں نے فوراً مجھے اندر بلا لیا۔ بڑی خندہ پیشانی اور محبت سے ملے۔ بہاولپور کا حال احوال پوچھتے رہے۔ لسانیات اور عروض پر گفتگو ہوئی تو معلومات کے دریا بہا دئیے۔ فارسی اور اردو ادبیات کا وہ بہت اچھا ذوق رکھتے ہیں۔ کثیر المطالعہ ہیں۔ قرآن وحدیث پر کافی عبور ہے۔ اقتصادی و معاشی مسائل پر بھی گہری نظر ہے۔ ان سے گفتگو کر کے بہت انشراحِ قلب ہوتا ہے اس دور میں ایسے افسران کا دم غنیمت ہے۔

احمد ندیم قاسمی کیا سے کیا ہو گئے؟

شام کو جناب احمد ندیم قاسمی اور جناب الطاف حسین قریشی مدیر اُردو ڈائجسٹ سے ملنے کا پروگرام تھا۔ بہن الطاف فاطمہ نے کہا تھا کہ ان دونوں کے پاس وہ بھی چلیں گی۔ چنانچہ انکی معیت میں شام ۵ بجے پہلے ہم فنون کے دفتر گئے۔ احمد ندیم قاسمی صاحب اپنے حواریوں میں گھرے بیٹھے تھے۔ میں انہیں

Marfat.com

ایک سلیم الطبع، میانہ رو اور شریف النفس ترقی پسند ادیب کی حیثیت سے کافی دن بعد انہیں دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ ان کے ان ظاہری احوال کے علاوہ صحت میں بھی انکے انحطاط کا عالم دیکھ کر دل کو دُکھ ہوا۔ بعض لوگوں کو ادبی محاذ لے بہت راس آتے ہیں لیکن میرا تاثر یہ ہے کہ قاسمی صاحب کے حق میں یہ شاید مفید ثابت نہیں ہوئے ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہیں مستقبل میں انکی تخلیقی صلاحیتیں بھی اس سے متاثر نہ ہوجائیں۔

بہرحال تھوڑی دیر تک اُن سے اِدھر اُدھر کی باتیں ہوئیں اور وہاں سے واپس ہم لارنس روڈ پر بہن الطاف فاطمہ کے گھر آگئے۔ سات بجے کیبعد الطاف قریشی صاحب کے ہاں جانا تھا۔ ان کا دفتر تو سمن آباد کی ۲۱ ویں ایکڑ سکیم میں ہے لیکن مکان ۱۱۶ ایکڑ سکیم میں بنایا ہے جو فاصلے میں پانچ مرلبعے کے برابر ہے۔ اس مہم کو سر کرنے کیلئے بھائی ابن احمد صاحب کو آمادہ کیا کہ وہ ہمیں اپنی کار میں وہاں لے چلیں۔ یہ سکیم جس زمین پر بنائی گئی ہے اس میں انکی ملکیہ زمین بھی تھی جو لاہور ڈیویلپمنٹ اتھارٹی نے ہاؤسنگ سکیم کیلئے حاصل کرلی تھی۔ لُطف کی بات یہ ہے کہ اس کے معاوضے کا مسئلہ ابھی تک طے نہیں ہوا ہے۔ لیکن لوگوں نے وہاں پلاٹ الاٹ کرا کے دھڑا دھڑ مکانات بنانے شروع کردیئے ہیں۔ بہرحال ہم سات بجے شام کو بھائی ابن احمد کی کار میں الطاف قریشی صاحب کے مکان پر پہنچے۔ اُن کا یہ مکان ابھی تعمیری مراحل سے گذر رہا ہے۔ الطاف صاحب قبل از وقت ہی اس میں منتقل ہوگئے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ ابھی تک اپنا سامان بھی سیٹ نہیں کرسکے ہیں۔ ہم اِن کے ہاں پہنچے تو جہاں وہ حیران ہوئے وہاں کچھ پریشانی کے آثار بھی دیکھنے میں آئے تاہم انہوں نے ہمیں اپنے ڈرائنگ روم میں بٹھایا جس پر ڈرائنگ روم سے زیادہ سٹور روم کا گمان ہوتا تھا۔ الطاف صاحب بڑے دلچسپ اور زندہ دِل آدمی ہیں۔ مزے مزے کی باتیں کرتے ہیں۔ پھر خود بھی ہنستے ہیں اور دوسروں کو بھی

Marfat.com

ہنساتے ہیں۔ سیاسیاتِ حاضرہ کا وسیع علم رکھتے ہیں۔ مشرق و مغرب کے اتار چڑھاؤ پر گہری نظر ہے حال ہی میں تہران وغیرہ کا دورہ کر کے آئے ہیں کافی دیر تک عراق و ایران جنگ کا تجزیہ کرتے رہے۔ چلتے ہوئے انہوں نے اردو ڈائجسٹ کا تازہ شمارہ بھی عنایت کیا۔ اس میں انہوں نے اپنے دورۂ تہران کے تاثرات مفصل طور پر قلمبند کئے ہیں۔ الطاف صاحب کا قلم ایک مصوّر کا قلم ہے۔ اور وہ لفظوں میں مشاہدات و واقعات کی اس طرح تصویر کھینچ دیتے ہیں کہ تمام پس منظر و پیش منظر نظروں کے سامنے آجاتے ہیں۔ ہم انکی پر لطف اور پُراز معلومات گفتگو میں اتنے محو ہوئے کہ وقت کا بھی پتہ نہ چلا۔ گھڑی دیکھی تو نو بج چکے تھے۔ بہن الطاف فاطمہ کہنے لگیں کہ مجھے تو گھر جا کر ابھی روٹی بھی پکانی ہے۔ جلدی جلدی کرو میری مہمان کیا کہے گی کہ میں آج اُسے بھوکا ہی مار دیا۔ ان کے ہاں ایک امریکی خاتون ٹھہری ہوئی ہیں جو پاکستانی ثقافت پر ریسرچ کر رہی ہیں۔ ویسے تو وہ گھر کے ایک فرد کی طرح رہتی ہیں لیکن انکے کھانے پینے کا بہر حال خیال رکھنا پڑتا ہے۔ غرض قریشی صاحب سے اجازت لیکر ہم واپس ہوئے۔ بھائی ابن احمد نے مجھے بہاولپور ہاؤس چھوڑ دیا اور مشہود انکے ساتھ ہی لارنس روڈ چلے گئے۔

لاہور میں یہ میری آخری رات تھی۔ صبح خیبر میل کے ذریعے میں بہاولپور کیلئے روانہ ہوگیا۔

Marfat.com

کراچی، کراچی ہے

شروع شروع میں ہندوستان سے کراچی کرنے والوں کا مامن ومسکن کراچی تھا۔ خاص طور پر دہلی، لکھنؤ، بمبئی، گجرات، بہار اور یو۔پی۔سی۔پی کے جو خاندان اپنے گھروں سے نکلے، انہوں نے کراچی کا ہی رُخ کیا۔ بعد میں اگرچہ بہت سے خاندانوں کو ملازمت اور معاش کے دیگر وسائل کی تلاش میں صوبہ سرحد اور صوبہ پنجاب کے مختلف شہروں میں بھی قسمت آزمائی کیلئے جانا پڑا۔ لیکن پھر بھی ہندوستان سے آنے والوں کی اکثریت کراچی میں رہی اور اسطرح کراچی مہاجروں کا شہر ہو کر رہ گیا۔ اللہ نے کراچی میں اتنی سمائی بھی دی تھی کہ اس نے لاکھوں کی تعداد میں آنے والے مہاجروں کیلئے اپنی آغوش وا کردی اور یہ اس میں سماتے ہی چلے گئے

اب کراچی ۱۹۴۷ء سے پہلے کا کراچی نہیں۔ جب اسکی آبادی مشکل سے دس پندرہ لاکھ کے قریب ہوگی۔ شہر بھی بندر روڈ اور صدر کے آس پاس تک محدود تھا لیکن اب کراچی ایک شہر نہیں بلکہ کئی شہروں کا مجموعہ ہے۔ میں تو اسے ایک ملک کہتا ہوں جس میں کئی چھوٹے بڑے شہر آباد ہیں۔ پھر یہ آبادیاں بیسوں میل پر پھیلی ہوئی ہیں، ایک آبادی سے دوسری آبادی تک جانے کیلئے پندرہ بیس میل سے کم فاصلہ طے نہیں کرنا پڑتا۔ ساٹھ ستر لاکھ پر مشتمل اس شہر کی آبادی کیلئے لوکل ٹرینوں کے علاوہ بسیں، منی بسیں اور ویگنیں ہر روٹ پر بے شمار چلتی ہیں لیکن پھر بھی کسی بس وغیرہ میں آسانی سے نہیں بیٹھا جا سکتا۔ اکثر مسافر مرغا بنے بسوں میں ٹھنسے نظر آتے ہیں۔ آٹو رکشہ اور ٹیکسیوں کی بھی خاصی بہتات ہے لیکن انکے میٹر ہوا سے بھی زیادہ تیز چلتے ہیں اور ہر کہہ و مہہ ان میں سفر کرنے کی عیاشی نہیں کر سکتا۔

Marfat.com

میرے اکثر عزیز رشتہ دار اور دوست احباب کراچی میں ہیں جن سے ملنے کبھی کبھار کراچی جانا ہوتا ہے۔ عموماً شادی بیاہ! کسی عزیز رشتہ دار کی وفات کراچی میں جانے کا بہانہ بن جاتی ہے لیکن اب کچھ دنوں سے میرے لئے کراچی میں دوگونہ کشش ہوگئی ہے۔ میری ایک بیٹی اور ایک بیٹے نے کراچی کو مستقلاً اپنالیا ہے۔ میری بیٹی کے خاوند عزیزی علی کاظم کا کاروبار کراچی میں ہے۔ وہ سندباد ایجنسی کے نام سے درآمد برآمد کا خاصے بڑے پیمانے پر کاروبار کرتے ہیں میرے بیٹے سید مشہود حسن رضوی سپنسر اینڈ کمپنی میں سید ہاشم رضا کے زیر سایہ مارکیٹنگ آفیسر کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

پہلے تو میں کبھی کبھار ہی کسی انتہائی ضرورت کے تحت کراچی جاتا تھا لیکن اب ان بچوں کی خاطر سال میں ایک دو بار کراچی کا پھیرا ہو ہی جاتا ہے۔ اب کے میرے مرحوم بھائی سید منصور حسن رضوی کے بیٹے سید مصطفٰے احسن رضوی کی شادی میں شرکت کرنا تھی۔ یہ شادی محترم نثار احمد زبیری ایڈیٹر اخبارِ جہاں کی بہن سے طے پائی تھی۔ یکم مئی کو نکاح اور ۲ مئی کو دعوتِ ولیمہ تھی مصطفٰے کا تقاضا تھا کہ میں انکے والد کی جگہ اس شادی میں ضرور شریک ہوں۔ خون کے رشتے بڑے جذباتی ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود کہ یہاں کی مصروفیات اتنی طویل غیر حاضری کی متحمل نہیں ہوسکتی تھیں لیکن مصطفٰے کی خاطر میں نے ۱۴ مئی کراچی میں قیام کا فیصلہ کیا۔ خیال تھا کہ یہ چودہ دن کراچی میں خوب گھوموں پھروں گا۔ اور اب کے تمام دوستوں اور عزیزوں کے گلے شکوے دور کردوں گا لیکن افسوس یہ آرزو پوری نہ ہوسکی ایک تو کراچی پہنچنے کے تین چار دن بعد ہی میری طبیعت خراب ہوگئی جسکی وجہ سے میری آمدورفت بہت ہی محدود ہوگئی دوسرے میرے داماد علی کاظم ان دنوں ملک سے باہر تھے اور ان کا ڈرائیور چھٹی پر تھا اسلئے کار کی عدم سہولت بھی میری دلخواہ

Marfat.com

چلت پھرت میں مانع رہی ۔چنانچہ جن عزیزوں کے پاس کاریں تھیں وہ خود ہی ملنے آتے رہے اور اپنے ساتھ اپنے گھروں میں لیجاتے رہے ۔یہ سب ہی ملازم پیشہ ہیں ۔عموماً کسی چھٹی کے دن یا پھر دفتری اوقات کے بعد انہیں فرصت ملتی ہے اسلئے انکی کاروں کا بھی پورا پورا فائدہ نہ اٹھایا جا سکا ۔بسوں اور ویگنوں کو دیکھ کر تو دم گھٹنے لگتا تھا ۔جہاں جانا ضروری ہوا وہاں ٹیکسیوں کا بھی سہارا لیا ۔میری اہلیہ اور سب سے چھوٹی بیٹی غزالہ بھی میرے ساتھ گئی تھیں ۔اسلئے عموماً آٹو رکشہ کی بجائے ٹیکسی کرنی پڑتی تھی ۔دو دفعہ لوکل ٹرین میں بھی ملیر ہالٹ سے کراچی سٹی تک کا سفر کیا ۔سٹی اسٹیشن سے اخبار جنگ کا دفتر اور سپنسر بلڈنگ نزدیک ہیں اسلئے دونوں جگہ کیلئے اسی ذریعہ کو استعمال کیا ۔اخبار جنگ کے دفتر میں میرے عزیز دوست اقبال احمد صدیقی سے ملنا تھا ۔لیکن وہ دونوں دفعہ نہ ملے البتہ سپنسر بلڈنگ میں جناب سید ہاشم رضا صاحب سے ملاقات ہوگئی ۔اُن کے کمرے میں پہنچا تو "الزبیر" کا تازہ شمارہ انکے سامنے رکھا تھا اور وہ "دلی نامہ" پڑھ رہے تھے چنانچہ صاحب سلامت کے بعد دلی نامہ ہی گفتگو کا موضوع بنا رہا ۔اسی ضمن میں انہوں نے بھی اپنے سفر لکھنؤ کے تاثرات بیان کئے ۔خاص طور پر ان کا ارشاد کہ جگہ جگہ ہندی میں سائن بورڈ اور سڑک یا روڈ کے بجائے مارگ فلاں، مارگ فلاں دیکھتے دیکھتے میری زبان سے بے ساختہ نکلا کہ لکھنؤ میں یہ دراصل "مرگِ اُردو" کا اعلان ہے میں نے کہا کہ سائن بورڈ تو دلی میں بھی ہندی اور انگریزی میں ہی ملتے ہیں اور سڑکوں کی بجائے مارگ کا لفظ وہاں بھی استعمال ہوتا ہے لیکن وہاں اتنا ضرور ہے کہ ہندو اور مسلمان گفتگو اُردو میں ہی کرتے ہیں ۔گویا بول چال سے اُردو اب بھی ختم نہیں ہو سکی ہے ۔

سید ہاشم رضا صاحب بڑے مرنجاں مرنج اور وضعدار لوگوں میں سے ہیں

Marfat.com

اگر میں کہوں کا لکھنؤی ثقافت اور لکھنوی رکھ رکھاؤ کے اس وقت وہ کراچی میں تنہا امین ہیں تو کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔ ان کے ادبی و شعری ذوق کا اندازہ اس سے کیجئے کہ کوئی آدھے گھنٹے کی ملاقات میں انہوں نے بیسیوں ادبی محفلوں کا تذکرہ اور متعدد لکھنوی و دہلوی شعرائے کے اشعار سُنا ڈالے۔ خدا نے انہیں جہاں حافظہ غضب کا دیا ہے وہاں واقعات کے بیان میں وہ سحر طرازی و دلربائی ہے اسکا بھی جواب نہیں۔ جب وہ باتیں کرتے ہیں تو دل چاہتا ہے کہ وہ بولتے ہی رہیں گویا " وہ کہیں اور سُنا کرے کوئی "۔ میں رخصت ہونے لگا تو فرمانے لگے کہ ابھی تو آپ کا کراچی میں قیام ہے انشاء اللہ پھر ملاقات ہوگی۔ غرض وہاں سے چلا تو برخوردار مشہود بھی میرے ساتھ ہو گئے۔ انہوں نے کہا کہ عطا رصاحب کا دفتر راستے ہی میں پڑتا ہے۔ اسلئے اُن سے بھی مل لیجئے۔ آپ کو بہت یاد کرتے ہیں۔ حسن میاں عطار صوبہ سندھ کے ڈاریکٹر تعلقات عامہ ہیں۔ میرے بڑے عزیز دوستوں میں سے ہیں۔ اُن سے میرے گھر کے سے تعلقات ہیں۔ بڑے خوش خلق اور زندہ دِل انسان ہیں۔ بڑے تپاک سے ملے۔ تھوڑی دیر بعد انہوں نے اس شرط کے ساتھ مجھے چھٹی دی کہ شام کو اہلیہ اور بچی کو ساتھ لیکر اُن کے گھر آؤں گا۔ وہ سوسائٹی میں رہتے ہیں لہذا سوچا یہ تھا کہ شام کو سوسائٹی میں ان سب سے ملاقات ہو جائیگی لیکن سوسائٹی میں دو ایک جگہ ہی گیا تھا کہ رات کے نو بج گئے۔ اب ایسے وقت میں عطار صاحب کے ہاں جانے سے اہلیہ متامل تھیں لیکن میں نے کہا کہ ان کے ہاں کوئی تکلیف ہو اور نہ وہ اتنی جلدی سونے والے ہیں۔ بہتر ہوگا کہ ابھی اُن کے ہاں ہو آئیں ورنہ پھر نہ جانے اُن کے ہاں جانا ہو یا نہ ہو لہذا ہم وہاں پہنچے تو عطار صاحب اور انکی اہلیہ انتظار کرتے کرتے ہماری طرف سے مایوس ہو چکی تھیں لیکن ہمیں دیکھ کر گویا اُن کے دِل کی کلی کِھل گئی۔ فوراً لپا کے چھپا کے سے چائے کا انتظام کرنے لگیں تو میں نے

Marfat.com

کہا عطار صاحب تکلف برطرف ہم چائے نہیں پئیں گے بلکہ کھانا کھائیں گے۔ کہنے لگے اگر پہلے سے معلوم ہوتا تو کچھ گھر میں پکوالیتا لیکن اب تو بازار سے پکا پکایا منگوانا پڑے گا۔ میں نے کہا یہ تو اور بھی اچھا ہے۔ بیچاری بھابی چولھے توے کے وبال سے بھی بچ جائیں گی اور ہم جیسے ناخواندہ مہمانوں کی خاطر بھی ہو جائے گی۔ غرض تھوڑی دیر میں کھانا آگیا۔ ہم سب نے سیر ہو کر کھایا۔ کھانے کے بعد بھابی نے خوبصورت کاغذ میں لپٹا ہوا حلوہ سامنے رکھ کر کہا کہ اسے ہمارے بمبئی میں افلاطون کہتے ہیں۔ کھائیں گے تو ہونٹ چاٹتے رہ جائیں گے۔ واقعی حلوہ بڑا مزیدار تھا لیکن بھابی اور عطار صاحب کی باتیں حلوے سے بھی زیادہ لذیز تھیں جس سے ہم دیر تک لطف اندوز ہوتے رہے۔ کوئی گیارہ بجے ہم وہاں سے رخصت ہو کر ملیر کیلئے روانہ ہوئے۔

اگلے روز مشہود دفتر سے واپس آئے تو انہوں نے سید ہاشم رضا صاحب کا خط لاکر دیا جس میں انہوں نے ۶ مئی کو اختر حسین مرحوم سابق سفیر پاکستان در ایران کے مکان پر ایک مشاعرے میں شرکت کی دعوت دی تھی۔ ساتھ ہی حکیم نثار احمد علوی کی تصنیف "شب چراغ" کا تحفہ بھی تھا۔ شب چراغ متعدد شخصیتوں کے سوانحی خاکوں پر مشتمل ہے۔ سوانحی خاکے کیا ہیں شخصیتوں کی منہ بولتی تصویریں ہیں۔ ہر شخص کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا تجزیہ بڑے حقیقت پسندانہ اور دلکش انداز میں کیا ہے سید ہاشم رضا صاحب کے متعلق یہ فقرہ "وہ اودھ کی روایتی تہذیب کا تاج محل ہیں" سارے مضمون کی جان ہے۔ کتاب پڑھنی شروع کی تو دن گذرنے کا پتہ ہی نہ چلا۔ آج کا دن میں نے کلفٹن میں اپنے ایک بھائی بشیر حسین کے ہاں گذارا تھا۔ یہ کارپوریشن میں انجنیئر ہیں۔ آٹھ بجے رات کو یہ ہی مجھے سوسائٹی میں اختر حسین مرحوم کے مکان پر چھوڑ کر آئے۔ اختر حسین مرحوم کے صاحبزادے انگریزی میں شعر لکھتے ہیں۔ انگلستان میں "Poetry Prizes" حاصل کر چکے ہیں۔ انہوں نے کراچی میں Mixed Voices

Marfat.com

(دہلی جُلی آوازیں) کے نام سے ایک انجمن قائم کی ہے۔ جس کے شاعروں میں اردو، سندھی اور انگریزی زبانوں کے شعراء شرکت کرتے ہیں، کلام اور طعام کا انتظام ہوتا ہے۔ یہ اپنی نوعیت کا منفرد مشاعرہ تھا۔ شعراء کے علاوہ شاعرات بھی شریکِ مشاعرہ تھیں۔ بعض شعراء و شاعرات نے انگریزی، پشتو، سندھی، بنگالی اور اردو میں اپنا کلام سُنایا۔ پشتو، سندھی، بنگالی نظموں کا انگریزی میں بھی ترجمہ پیش کیا گیا یہ تقریباً تمام نظمیں جاپانی صنفِ سخن ہائیکو کے طرز پر تھیں۔

اُردو شعراء میں میرے علاوہ جناب سید ہاشم رضا، شبنم رومانی اور ایک دو دوسرے حضرات تھے۔ میں نے دیکھا کہ جس مشاعرے کے سامعین اکثر انگریزی خواں تھے وہ ہماری اُردو شاعری سے بھی خاصے محظوظ ہوئے۔ غرض سید صاحب کے طفیل اس انوکھے اور دلچسپ مشاعرے میں شرکت نے مجھے ایک نئے اور خوشگوار تجربے سے دوچار کیا۔

اگلے چار پانچ دنوں میں کسی ادبی تقریب کا پروگرام نہ تھا۔ اسلیئے یہ دن میں نے ملاقاتوں کیلئے وقف رکھے۔ اگرچہ ناسازیٔ طبع کہیں آنے جانے میں خاصی مزاحم تھی لیکن پھر بھی جہاں تک ہو سکا میں چلتا پھرتا رہا۔ نازش حیدری میرے خواجہ تاش ہیں لیاقت آباد میں رہتے ہیں۔ ایک دن میں اُن سے ملنے گیا، یہ خاصے بیمار ہیں تاہم انکے بیٹے اور بہوئے بڑی خاطر تواضع کی۔ ہم دوبارہ آنے کا وعدہ کرکے وہاں سے رُخصت ہوئے اور اپنے ایک عزیز محی الدین اشرف کے ہاں جوہر آباد چلے گئے۔ یہ پاکستان ٹیلی ویژن کراچی میں ایڈمنسٹریٹو آفیسر ہیں۔ بڑی محبت کے آدمی ہیں۔ انہوں نے منع کرنے کے باوجود پُر تکلف کھانے کا انتظام کیا ہوا تھا۔ اِن کے ہاں کھانا کھانے کیبعد اپنی ایک ہمشیرہ اور محی الدین اشرف کی چچا زاد بہن اور بہنوئی سید اسد علی گیلانی کے ہاں گئے۔ یہ بھی بہت تپاک اور خلوص سے ملے۔ ان کے ہاں چائے

Marfat.com

پیتے پیتے اور باتیں کرتے کرتے رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ لہذا ہم نے انکے بچے کو ٹیکسی لانے کیلئے بھیجا۔ چند منٹ میں ہماری ٹیکسی آگئی۔ اور ہم اسد صاحب اور انکی اہلیہ سے اجازت لیکر ملیر کیلئے روانہ ہوگئے۔

میرے ملاقاتیوں میں کنور محمد اعظم خسروی بھی میرے کرم فرماؤں میں سے ہیں اور ناظم آباد میں رہتے ہیں۔ حالانکہ ملیر سے ناظم آباد کا فاصلہ کافی طویل ہے لیکن اس کے باوجود میں دوسرے دن شام کو آٹو رکشہ کرکے اُن سے ملنے گیا۔ یہ جے پور کے رہنے والے ہیں۔ بہت پختہ گو شاعر ہیں۔ ادبی و علمی نکات پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ وہ خط نویسی کے معاملے میں جس قدر مستعد ہیں اتنا ہی میں کوتاہ قلم واقع ہوا ہوں جو اکثر انکی برہمی کا باعث بھی ہوتا ہے۔ مگر اب میری اس کوتاہی کو وہ بے نیازی کی بجائے میری کمزوری پر محمول کرنے لگے ہیں۔ اسلئے ان سے برابر بنھ رہی ہے۔ بہرحال کچھ دیر اُن سے گپ شپ کرکے ناظم آباد میں ہی اپنے ایک اُستاد بھائی عزیز حیدری سے ملنے گیا۔ وہ لاہور گئے ہوئے تھے۔ تاہم ان کے بیٹے نے اصرار کرکے مجھے کچھ دیر بیٹھنے کیلئے مجبور کیا۔ اور چائے سے تواضع کی۔ اب کہیں اور جانے کی ہمت نہیں تھی۔ اسلئے میں مشہود کو ساتھ لیکر ملیر آگیا۔

اب جوں جوں کراچی میں میرے قیام کی مدّت ختم ہو رہی تھی۔ میری پریشانی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ کیونکہ ابھی بہت سے دوست و احباب سے مُلاقات نہیں ہوسکی تھی میرا دل چاہتا تھا کہ ڈاکٹر محمد ایوب قادری سے ملوں۔ یہ میرے پرانے کرم فرما ہیں سلمان شاہ جہانپوری سے ملے ہوئے بھی ایک زمانہ گذر گیا تھا۔ پروفیسر عتیق احمد، صہبا اختر، رئیس امروہی، سید محمد تقی، مشفق خواجہ کرار نوری اور راغب مُراد آبادی جن سے بڑی یاد اللہ ہے سب ہی رہے جارہے تھے۔ اور ان سے ملنے کا کوئی واسطہ نہیں مل رہا تھا۔ خود اتنی سکت نہ تھی کہ بغیر کسی رہنما کے اُن تک پہنچ سکتا۔

Marfat.com

مشہود سلمہ ۵ بجے کیبعد دفتر سے آتے تو مشکل سے کسی ایک آدھ عزیز تک پہنچ سکتے اور رات ہوجاتی دو تین دن ہم نے اپنے عزیز عرفان عثمانی کے ہاں گذارے یہ حبیب بینک میں وائس پریذیڈنٹ ہیں۔ انکی اہلیہ بھی میرے رشتے کی بہن ہیں دونوں میاں بیوی میں بلا کا خلوص ہے۔ ان سب کے ہاں بھی گھر کا سا آرام ملا۔ دو دفعہ اپنی ایک اور بہن عظمت سبزواری کے ہاں جنکا مکان فیڈرل بی ایریا میں مشہود کے مکان کے قریب ہی رہتے ہیں۔ پچھلے فسادات میں مشہود کا زیادہ وقت ان کے ہاں ہی گذرا۔ دونوں میاں بیوی مشہود کا ہر طرح خیال رکھتے ہیں۔

۱۱ مئی کو عزیزی مصطفٰے کی سسرال میں چلا گیا تھا۔ اسی روز جناب جمیل نظر نے میرے اعزاز میں ایک پارٹی کا انتظام کر رکھا تھا۔ لہذا پہلے مشہود کے ساتھ انکے ہاں گیا یہاں دوسرے احباب کے علاوہ حاجی حنیف طیب اور منظر ایوبی سے بھی ملاقات ہوگئی۔ شاعر جہاں جمع ہوجائیں شاعری کا دور چل ہی نکلتا ہے لہذا جمیل نظر صاحب کی فرمائش پر ایک نعتیہ شاعری کا دور ہوگیا۔ نمازِ مغرب ہم نے جمیل صاحب کے مکان پر باجماعت ادا کی۔ یہاں سے ہم نثار احمد زبیری صاحب کے ہاں گلشن اقبال پہنچے یہاں سب ہمارے منتظر تھے۔ زبیری صاحب سے دیر تک صحافت و سیاست کے موضوعات پر گفتگو رہی۔ نو بجے کے بعد طعام کا سلسلہ شروع ہوا۔ بڑا لذیذ اور پر تکلف کھانا تھا۔ ۱۱ بجے کے قریب مہمانوں کی واپسی ہوئی۔ اور ہم بھی ٹیکسی کر کے ملیر تقریباً گیارہ بجے رات کو پہنچے۔

اگلے دن یعنی ۱۲ مئی کو دعوتِ ولیمہ تھی۔ اسی دن کیلئے سید ہاشم رضا صاحب کی جانب سے یہ پیغام ملا تھا۔ کہ آج نیشنل سنٹر میں انکی زیرِ صدارت مولانا حسرت موہانی کی یاد میں جلسہ ہے جس میں مَیں بھی شریک ہوں۔ میں نے تقریباً سولہ سترہ سال پہلے مولانا حسرت موہانی پر ایک نظم کہی تھی جو محترم اشتیاق

Marfat.com

اظہر کے زیرِ اہتمام بہاولپور کے ایک جلسے میں پڑھی تھی۔ یہ نظم دوسرے مضامین کے ساتھ چھپی بھی تھی۔ میں نے اپنی بیاض ٹٹولی تو اس میں یہ نظم نہ ملی۔ پھر خیال آیا کہ اشتیاق اظہر کے پاس یہ ضرور ہوگی۔ ان کی بیماری کے متعلق معلوم ہوا تھا لہذا سوچا کہ ان کی مزاج پرسی بھی ہو جائیگی۔ اور نظم بھی اُن سے مل جائیگی۔ لہذا ایک پنتھ دو کاج کا یہ پروگرام بنا کر ہم اُن کے ہاں پہنچے یہ بڑے خلوص و محبت سے ملے اور میری نظم بھی انہوں نے مجھے عنایت کر دی۔

دوسرے شام کو مشہود کے ہمراہ نیشنل سنٹر پہنچا تو اشتیاق اظہر صاحب تقریر کر رہے تھے۔ ہاشم رضا صاحب کی نظر مجھ پر پڑی تو انہوں نے اشارہ کر کے مجھے اپنے ساتھ سٹیج پر بٹھا لیا۔ اشتیاق اظہر صاحب نے اپنی تقریر ختم کرتے ہی حاضرین سے میرا تعارف کرایا۔ اور بتایا کہ مولانا حسرت موہانی پر اپنی وہ معرکتہ الآراء نظم پڑھوں گا۔ جسے پہلے بھی کئی جلسوں میں میری طرف سے سنا چکے ہیں۔ اس اعلان کے بعد میں نے اپنی نظم پڑھی جس کا عنوان تھا "بزمِ ازل اور حسرت" اس میں بتایا گیا تھا کہ جب بزمِ ازل میں لوگوں کو مختلف انعامات و اعزازات سے نوازا جا چکا تو قدرت کی طرف سے اعلان ہوا کہ رحمتِ باری ابھی جوش میں ہے۔ اگر کوئی ان جملہ اعزازات و انعامات کا بار اٹھانے کی ہمت رکھتا ہے تو آگے بڑھے تاکہ خالق باری تعالیٰ اُسے اپنے جملہ انعامات و اعزازات سے سرفراز کرے۔ اس اعلان پر مولانا حسرت موہانی آگے بڑھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ؎

میں بندہ کمزور ہوں اسکا نہیں شکوہ — رکھتا ہوں تیرے فضل سے لیکن بڑی جرأت
جتنی بھی عنایات ہیں وہ سونپ دے مجھکو — بخشی ہے ترے لطف نے احساس کی قوت
میں حکم کی تعمیل کروں گا دل و جاں سے — ہوگی نہ تیرے سامنے محشر میں ندامت
یہ سُن کے فرشتوں کو دیا حکم حق نے — ہاں سونپ دو اسکو میری ایک ایک فضیلت

Marfat.com

فوراً ہوئی پابندی فرمانِ الٰہی — وہ بندہ سرفراز ہوا حسبِ مشیّت
سنجیدگی علم، فراوانیٔ اخلاق — عرفانِ جہاں، جذبۂ آزادی و عزت
تخیّل کی پرواز نگاہوں کی بلندی — قسمت گریٔ قوم، خبر گیریٔ ملت
کچھ بھی نہ بچا اسکی طلب خیز نظر سے — اشعار کی تخلیق نہ حکمت نہ سیاست
القصّہ سرفراز ہوا مردِ مسلماں — سمجھایا گیا اسکو ہر آئینِ قیادت
اُترا وہ جہاں میں ہمہ اوصاف کے ہمراہ — پروانوں کے حلقے میں رہا شمع کی صورت
سرگرم ہوا خدمتِ ابنائے وطن میں — انجام دیئے اپنے فرائض بہ نفاست
ہر سانس گل افشاں تھا سرِ محفلِ آفاق — اللہ رے طبع سخن آرا کی وہ جدّت
آزادیٔ ملّت کیلئے عمر گنوا دی — آخر کو ملا حاصل افتادِ طبیعت
اقدام کوئی تشنۂ تکمیل نہ چھوڑا — حسرت کوئی باقی نہ رہی واہ رے حسرت

اس کے بعد ایک اور صاحب نے مولانا حسرت کی زندگی پر ایک مضمون پڑھا اور آخر میں صاحبِ صدر جناب سید ہاشم رضا مائیک کے سامنے آئے۔ اور انتہائی شگفتہ و دلکش انداز میں سید الاحرار مولانا حسرت موہانی کو خراج عقیدت پیش کیا۔ یہاں سے میں اظہر صاحب کے ہمراہ انکی کار میں دلّی مسلم ہوٹل گیا۔ یہاں مصطفٰی کی طرف سے دعوتِ ولیمہ تھی۔ ابھی تک مہمان یہاں نہیں پہنچے تھے۔ میں پہلا آدمی تھا جو اس دعوت میں سب سے پہلے پہنچا تھا۔ بہر حال تھوڑی دیر بعد مہمان آنے شروع ہوگئے۔ میری طبیعت اس وقت کچھ اتنی خراب تھی کہ میں وہاں بمشکل بیٹھ سکا۔ بہت سے عزیزوں سے صرف صاحب سلامت ہی ہوئی اور کوئی بات چیت نہ کر سکا۔ دعوت کے فوراً بعد ٹیکسی کر کے واپس ملیر چلا گیا۔ کیونکہ مزید وہاں ٹھہرنے کی اب مجھ میں سکت نہیں رہی تھی۔

آج ۱۳ مئی تھی اور کراچی میں میرا آخری دن تھا۔ قافلہ ادب والوں نے فیڈرل۔ بی ایریا میں مشہود کے مکان کے قریب ہی میرے اعزاز میں آج شام ایک

مشاعرے کا اہتمام کیا ہوا تھا۔ قافلۂ ادب نوجوان شاعروں اور ادیبوں کی تنظیم ہے اور مشہود اسکے کرتا دھرتا ہیں۔ دوسرے نوجوان جو اس میں شامل ہیں وہ بھی بڑے سرگرم ہیں۔ یہ مشاعرہ شاہ قاسم جہانگیری کے دولت کدہ پر تھا جس میں بیس پچیس کے قریب شاعر شریک تھے۔ لیکن مجھے یہ دیکھ کر حیرت رہی کہ نوجوانوں کی تنظیم کی طرف سے جو مشاعرہ ہوا۔ اس میں اکثریت بزرگ شاعروں کی تھی۔ جن میں سے کوئی بھی ساٹھ ستر سے کم عمر کا نہ تھا۔ اور مزید حیرانی کی بات یہ تھی کہ ان بڑے شاعروں کے اشعار میں جوانوں کی سی ترنگ اور جدید خیالات و افکار کی فراوانی تھی۔ قافلۂ ادب والے قابلِ مبارک باد ہیں کہ انہوں نے اپنی ادبی سرگرمیوں میں بزرگ شاعروں کو یکسر نظرانداز نہیں کیا بلکہ انکی سرپرستی میں ہی یہ قافلہ رواں دواں ہے جو یقیناً انکے مستقبل کی کامیابی کا ضامن ہوگا۔

جب تک میں مشاعرے میں رہا میری اہلیہ اور بڑی بیٹی مشہود کے مکان میں رہیں اور انکے ہمسایوں سے ملتی جلتی رہیں۔ مشاعرے کے بعد میں ان سب کو لیکر ایک دو عزیزوں سے ملتا ملاتا رات گئے واپس ملیر پہنچا۔

صبح صبح اقبال صدیقی صاحب کا ٹیلی فون آیا۔ وہ بہت دیر تک لے پنے نہ ملنے کا افسوس کرتے رہے۔ پھر انہوں نے مولانا ماہر القادری کی یاد میں ایک جلسہ میں میری عدم شرکت کا گلا بھی کیا۔ اس میں شرکت نہ کرنے کا مجھے بھی افسوس ہے۔ لیکن قافلۂ ادب کے مشاعرے کی وجہ سے میری اس میں شرکت ممکن نہ تھی۔ ویسے میری دلی خواہش تھی کہ میں مولانا ماہر القادری کی یاد میں جو جلسہ ہوا تھا اس میں ضرور شریک ہوتا۔ اگر شریک ہو جاتا تو کم از کم اس غلط فہمی کو میں اپنے طور پر تو دور کر دیتا جو مرحوم کے دل میں میری طرف سے پیدا ہو گئی تھی اور جس کا اظہار اشارے کنائے میں فاران کے اُس ایڈیٹوریل میں مولانا ماہر نے کیا تھا جو اُن کے انتقال کے بعد شائع ہوا تھا ...... واقعہ یہ تھا کہ ۱۹۶۲ء میں میرا پہلا مجموعہ کلام "نقوشِ شہاب" شائع ہوا تو فاران میں اس پر ۸ صفحات کا

Marfat.com

تبصرہ کیا گیا جس میں سے چار صفحات تو میری تعریف و توصیف اور اشعار کے روشن پہلوؤں پر مشتمل تھے۔ اور آخری ۴ صفحات میں کچھ اشعار پر تنقید کیگئی تھی تنقید وہ ہمیشہ جارحانہ انداز میں کرتے تھے۔ چنانچہ میرے جن اشعار پر تنقید کیگئی تھی وہ تنقید سے زیادہ تنقیص تھی۔ میں نے تو فاران کے اس تبصرے پر کسی ردعمل کا اظہار نہ کیا۔ لیکن میرے ایک دوست بہت برہم ہوئے اور انہوں نے مجھے مجبور کیا کہ میں اس کا جواب لکھوں۔ جب میں نے اپنے نام سے اس کا جواب چھاپنا مناسب خیال نہ کیا تو انہوں نے کہا لکھ دیں وہ چھپوائیں گے وہ اپنے نام سے۔ چنانچہ ان کے اصرار پر میں نے فاران کے اعتراضات کا جواب لکھا اور وہ میرے دوست کے نام سے چٹان میں چھپ گیا۔ مولانا ماہر بھی اس معاملے میں مغضوب الغضب واقع ہوئے تھے۔ وہ اگر خاموش ہو جاتے تو بات ختم ہو جاتی لیکن انہوں نے شہاب میں جو اُن دنوں مولانا کوثر نیازی کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ اس کا جواب الجواب لکھوایا۔ ادھر میرے دوست نے بھی مجھ سے پھر اس کا جواب لکھوایا جس کے بعد نہ انہوں نے کچھ لکھا اور نہ میری طرف سے کچھ لکھا گیا۔ بات آئی گئی ہو گئی لیکن یہ عجیب سوئے اتفاق ہے کہ اس واقعہ کے بعد مولانا ماہر القادری سے میری کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ میرے اِن کے تعلقات چالیس سال سے زیادہ عرصے پر محیط تھے۔ جب وہ حیدر آباد دکن میں کسی سکول میں مدرس تھے۔ اُس وقت سے اُن سے خط و کتابت تھی۔ میرے "الہام" میں انکے مضامین نظم و نثر بڑی باقاعدگی سے شائع ہوتے تھے۔ میں یہ تصور بھی نہ کرسکتا تھا کہ نقوش، شہاب پر تبصرہ کا تبصرہ میرے ان کے تعلقات کے انقطاع کا سبب بن جائیگا۔ لیکن میں نے جب فاران کا یہ اداریہ پڑھا جس کا مفہوم یہ تھا کہ " ان کے تبصروں کی وجہ سے اُن سے کیسے کیسے دوست اُن سے روٹھ گئے اور انہیں اسکی کتنی بھاری قیمت ادا کرنی پڑی۔ یہاں تک کہ ایک صاحب جن سے میرے

Marfat.com

دیرینہ تعلقات تھے اور وہ بہاولپور میں مقیم ہیں۔ میرے تبصرے سے اسقدر ناراض ہوئے کہ انہوں نے اس کے بعد بہاولپور کے کسی مشاعرے میں مجھے مدعو نہیں کیا" تو میں کلیجہ مسوس کر رہ گیا۔ اگر ان کے انتقال سے پہلے یہ اداریہ چھپ جاتا تو میں یقیناً ان سے مِلکر یا خط لکھ کر انکی غلط فہمی دور کرا دیتا۔ حاشا وکلا میرے دِل میں انکی طرف سے ذرا بھی ملال نہ تھا۔ اُنکے تبصرے کا جواب تو محض تفنن طبع یا ایک دوست کی دلداری کے طور پر لکھا گیا تھا اور بس! جہاں تک بہاولپور کے مشاعروں میں انکو مدعو نہ کرنے کا تعلق ہے اسکی حقیقت صِرف یہ ہے کہ بہاولپور میں جو بھی مشاعرے ہوتے رہے اُن سے عملاً میں بے تعلق رہا۔ خاص طور پر بیرونی شعرا کو مدعو کرنے میں میرا کبھی ہاتھ نہ رہا ورنہ یہ کب ہو سکتا تھا کہ کسی مشاعرے کا میں منتظم ہوں اور ماہر صاحب کو نہ بلاؤں وہ اب اس دنیا میں نہیں لیکن سچی بات کہہ کر میں دِل کا بوجھ ہلکا کر رہا ہوں شاید میرے اس بیان سے انکی رُوح بھی مطمئن ہو جائے۔

آج میری واپسی تھی لیکن شام کو کوئی ۴½ بجے گلشن اقبال میں مولانا محمد ناظم ندوی مجھے ظفر انصاری صاحب کے ہاں لیگئے۔ انصاری صاحب بڑی محبت سے مِلے پر تکلف چائے بھی پیش کی اور یہ افسوس کرتے رہے کہ میری آمد کی اطلاع انہیں پہلے نہ ہوئی ورنہ طعام کا سلسلہ بھی رہتا اور باتیں بھی زیادہ تفصیل سے ہو سکتیں تاہم میں عصر سے مغرب تک ان کے ہاں رہا۔ اور مختلف سیاسی موضوعات پر تبادلۂ خیالات ہوتا رہا۔ مولانا انصاری بڑے پرانے مسلم لیگی ہیں۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے اسسٹنٹ سیکرٹری بھی رہے ہیں۔ مُلکی سیاسیات پر انکی بڑی گہری نظر ہے۔ متوقع آئینی ڈھانچے کے متعلق بھی بعض انکی بڑی مثبت تجاویز ہیں۔ مثلاً انہوں نے صوبائی عصبیتوں اور جارح قومیتوں کے فتنے کو ہمیشہ کیلئے ختم کرنے کے سلسلے میں یہ تجویز رکھی ہے کہ پاکستان کے تمام ڈویژنوں کو صوبائی درجہ دے دیا جائے۔ اس میں اگرچہ کچھ قباحتیں

Marfat.com

ہیں لیکن اگر یہ تجویز منظور کر لی گئی تو صوبائی عصبیتوں کے خاتمہ میں اس سے یقیناً مدد ملے گی۔

وہاں سے رخصت ہو کر ملیر پہنچا تو آٹھ بج رہے تھے خیبر میل میں ہماری سیٹیں تو مخصوص تھیں لیکن وہاں سے اسٹیشن کا فاصلہ بھی آدھے گھنٹے سے کم کا نہیں۔ لہذا میں نے جلدی جلدی دو چار نوالے کھائے اور سب سے رخصت ہو کر اسٹیشن روانہ ہو گیا۔ یہاں میری بڑی بھاوج، اُنکے بچے اور دوسرے کئی عزیز و اقارب ہمیں چھوڑنے آئے ہوئے تھے۔ ٹھیک نو بجے خیبر میل کراچی سے روانہ ہوئی اور اگلے روز دن کے گیارہ بجے ہم بہاول پور پہنچ گئے۔

Marfat.com

Marfat.com

Marfat.com